برصغیر میں مسلم عائلی قوانین کے ارتقا:

نفاذ اور اثرات کا جائزہ

(۱۸۵۷ء-۱۹۴۷ء)

شگفتہ عمر ٭

ABSTRACT

The paper explores the corollaries of British intrusion on the Muslim Family Laws of the subcontinent. It tries to bring in the light the reasons that made the Imperial rule to do so. Moreover it examines the reaction of Muslim intellectuals and public at large against this onslaught and the effects that have been left in the legislation of the latter period.

برصغیر میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اسلام کے فوج داری، دیوانی اور عائلی قوانین، ملکی قوانین کی حیثیت سے نافذ العمل تھے اور غیر مسلموں کو اپنے شخصی قوانین پر عمل کی آزادی تھی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی آبادکاری کے ابتدائی دور میں بمبئی ریگولیشن ایکٹ ۱۸۲۹ء سے نئی قانون سازی کا عمل شروع ہوا اور ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے فیصلہ کن سیاسی زوال کے بعد برطانوی حکومت کا متبادل نظام قضا بہ تدریج مروجہ اور مذہبی قوانین کی منسوخی کا ذریعہ بنا۔ ۱۸۶۰ء میں قانون شہادت اور قانون معاہدہ، ۱۸۹۸ء میں ضابطہ ء فوج داری اور ۱۹۰۸ء میں ضابطہ ء دیوانی کے نفاذ سے تمام فوج داری اور دیوانی معاملات میں شرعی احکامات منسوخ ہو گئے، البتہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کو اپنی تہذیب کے مطابق اپنے شخصی قوانین پر عمل درآمد کی اجازت دی گئی۔

۱۹۳۷ء کے شریعت ایپلی کیشن ایکٹ کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے عائلی و خاندانی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، خلع، نان و نفقہ، وراثت، حسب و نسب، ہبہ اور اوقاف وغیرہ کو اپنے قانون کے تحت طے کرنے کا اختیار

٭ انچارج، دعوہ مرکز برائے خواتین، دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

حاصل ہو گیا۔ البتہ مختلف دیگر حوالوں سے بھی قانون سازی عمل میں لائی گئی، مثلاً شادی شدہ خاتون کی پراپرٹی سے متعلق ایکٹ ۱۸۷۴ء گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ (Guardian and Wards Act) ۱۸۹۰ء، بندشِ بچگان شادی ایکٹ ۱۹۲۰ء، مسلم تنسیخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء وغیرہ۔ مذکورہ بالا عائلی معاملات کی قوانین سازی میں مسلمانوں کی فقہ میں موجود ہدایات کو باضابطہ قانون کی شکل دی گئی۔ یہ قوانین بعینہٖ یا معمولی ترمیمات کے ساتھ آج بھی پاکستان اور بھارت میں نافذ العمل ہیں۔

وہ کون سے مسائل تھے جن کے تحت برطانوی حکومت کو مسلمانوں کے لیے مذکورہ بالا قوانین کی تدوین اور نفاذ کی ضرورت پیش آئی؟ مسلم علما اور عوام کا ان پر کیا ردعمل آیا؟ نیز ان قوانین کے نفاذ کے فوری اور دور رس کیا اثرات مرتب ہوئے؟ اور مختلف عائلی معاملات کے بارے میں قوانین سازی کے حوالے سے فقہ اسلامی میں کیا کیا رجحانات پیدا ہوئے؟ یہ مقالہ انہی سوالات کا جواب دینے کی ایک کوشش ہے۔

مسلمانوں کے نظامِ خلافت کے انحطاط کے باعث بہ تدریج اسلامی قانون کی تنفیذ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق امور تغافل کی نذر ہوئے اور افراد اور معاشرے پر سے اسلام کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی، لیکن اسلامی انحطاط اور فساد کے ان ادوار میں بھی عدالتوں کا قانون کم و بیش اسلامی ہی رہا اور فیصلے اسلام کے قوانین کے تحت ہوتے رہے۔ ہندوستان کی مسلمان حکومتوں کا بھی یہی حال تھا حتیٰ کہ انگریز اور دیگر مغربی اقوام کی سیاسی و ذہنی غلامی کا دور شروع ہوا۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت کے دو پہلو البتہ قابل ذکر ہیں: ایک یہ کہ حکم رانوں کی مطلق العنانی و بے کرداری اور افراد اور معاشرے کی اسلامی قانون سے بڑھتی ہوئی بے تعلقی کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا، مفکرین و مصلحین اس صورت حال کو بدلنے کے لیے کوشاں رہے۔ دوسرے یہ کہ ان حکم رانوں کو اپنی مطلق العنانی اور بے کرداری کے باوجود کبھی اسلامی قانون کے کسی جزو کو باضابطہ منسوخ کرنے یا تبدیل کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

برصغیر کی مسلم حکومت کا قانونی نظام

مسلمانوں کے دورِ حکم رانی میں مسلمانوں کی حکومت شخصی تھی لیکن حکم رانی کا طریقہ، اصولی اور قانونی تھا۔ خلیفہ اور قاضی کے دو الگ الگ عہدے قائم تھے۔ عدلیہ اور انتظامیہ آزاد اور علاحدہ تھے۔ انصاف کے ذمے داروں کے عہدے منصف، قاضی اور قاضی القضاۃ تھے، جب کہ انتظامی ذمہ داروں کے عنوان امیر، خلیفہ، وزیر، نواب، بادشاہ اور شہنشاہ تھے۔ اس دور میں اسلام کے فوج داری، دیوانی اور عائلی قوانین، ملکی قوانین (law

of the land) کی حیثیت سے نافذ العمل تھے البتہ غیر مسلم اپنے مرّوجہ مذہبی قوانین کی روشنی میں اپنے احکام طلاق و وراثت کے فیصلوں میں آزاد تھے۔ چنانچہ ہر گروہ کے اپنے اپنے شخصی قوانین موجود رہے۔ ملکی انتظام کے لیے کوئی طے شدہ ضابطہ ٔ کار نہ تھا، بلکہ ہر علاقے اور حکومت / ریاست کا راجہ، نواب اور بادشاہ مطلق العنان تھا، پھر بھی قاضی اور قاضی القضاۃ کے فیصلوں کا پابند تھا۔ اکبر نے اسی پابندی کو اپنی آزادی کی رکاوٹ سمجھ کر ہٹانا چاہا تھا اور مختلف مذاہب کو یک جا کر کے ایک دینِ الٰہی مرتب کیا جسے موجودہ اصطلاح میں یک ساں سول کوڈ کہا جا سکتا ہے، جس کو مجدد الف ثانیؒ اور دیگر علماے حق کی کوششوں نے ناکام بنا دیا۔[۱]

اکبر کے بعد عالم گیر نے نظامِ قضا کے لیے ایک عام قانون وضع کر دیا جس کی بنیاد قرآن و حدیث اور اکابرِ اسلام کے فتاویٰ پر تھی، اس کا نام **فتاویٰ ہندیہ** یا **فتاویٰ عالمگیری** مشہور ہوا۔ ان فتاویٰ کو اس وقت تک مرکزی قانونی حیثیت حاصل رہی جب تک انگریزنے آکر انہیں منسوخ نہیں کر دیا۔[۲]

برطانوی دورِ حکومت میں ابتدائی قانونی نظام

برطانوی حکم رانوں نے یورپ کے طریقۂ زندگی کے طور پر قانون کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا، نیز انتظامی امور کے حوالے سے حکم رانی کے اصول و آئین منضبط کر کے چپڑاسی سے لے کر وائسرائے (Viceroy) تک کو اس کا پابند کر دیا۔ فوج داری اور دیوانی عدالتیں قائم کیں اور فوج داری عدالت کی نمائندگی کے لیے تھانے قائم کر دیے اور محکمۂ مال کی نمائندگی کے لیے تحصیل بنا دی۔ فوج داری کے لیے **تعزیراتِ ہند** مرتب کی جس میں چوری، ڈکیتی، دھوکہ فریب کا قانون پورے ملک کے لیے یک ساں بنا دیا۔ اسی طرح دیوانی معاملات میں مالیات کا یک ساں قانون نافذ کر دیا، البتہ عائلی مسئلے کے لیے ہر قوم کو اپنے مذہب کے قانون پر عمل کرنے کی آزادی دے دی گئی۔[۳]

برطانوی دورِ حکومت میں باقاعدہ قانون سازی کا آغاز

برطانوی آباد کاری کے ابتدائی دور میں ۱۸۱۸ء میں بمبئی کے علاقے پر برطانوی حکومت کے قیام کے بعد اس علاقے میں پہلی قانون سازی (enactment) ۱۸۲۹ء کا بمبئی ریگولیشن ایکٹ VI تھا۔ جس کے

۱- سیّد حامد علی، **محمڈن لاء اور اس میں تبدیلی**، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ط ۳، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱، ۱۲، محمد افضال الحق قاسمی ''مسلم پرسنل لا کیا ہے''، خصوصی اشاعت **مسلم پرسنل لاء، دارالعلوم نمبر**، مارچ و اپریل ۱۹۸۶ء، ص ۵۸

۲- نفسِ مرجع، ص ۵۹

۳- نفسِ مرجع، ص ۵۹، ۶۰

مطابق مقدمات کی صورت میں پہلی ترجیح پارلیمنٹ کی قانون سازی (legislation) اور حکومت کے طے کردہ ضوابط (regulations) کو حاصل تھی۔ متعلقہ معاملے میں کسی قانون سازی یا حکومتی ضوابط کی عدم موجودگی میں اس علاقے میں موجود رواج، جو بہ منزلہ قانون (customary law) تھے، تعامل (usage) اور مدعی کے قانون کو بالترتیب فیصلہ کن قرار دیا گیا بہ شرطے کہ ایسا کوئی قانون / رواج کسی قانون مجریہ سرکار کی رُو سے تبدیل یا منسوخ نہ ہو گیا ہو۔ بہ صورتِ دیگر حاکم کو عدل و انصاف اور نیک نیتی سے فیصلے کا مجاز ٹھہرایا گیا۔[۴] مدعی کے قوانین سے مراد ہندوستان میں موجود مختلف طبقات / اقوام یعنی مسلم، ہندو، پارسی، جین، یہودی اور بدھ مت کے عائلی معاملات سے متعلق رواج / طریقے یا قوانین تھے۔

پنجاب پر انگریزوں کا تسلط ۱۸۴۹ء میں قائم ہوا۔ پہلے پنجاب سول کوڈ ۱۸۶۱ء اور پھر پنجاب لاز ایکٹ IV، ۱۸۷۲ء میں نافذ ہوا، جس کے بعد بالترتیب بنگال، آگرہ اور آسام سول کورٹس ایکٹ XII ۱۸۸۷ء اور شمال مغربی سرحدی صوبے کا قانون اور جسٹس ریگولیشن XII ۱۹۰۱ء میں نافذ ہوئے۔[۵]

پنجاب لاز ایکٹ کے سیکشن ۵ کے مطابق وراثت، خواتین کی جائیداد / ملکیت (Special property of females)، شادی اور خاندان سے متعلق تمام معاملات میں فیصلہ کن ترجیحی اتھارٹی رواج (customary law) کو حاصل تھی۔ بہ صورت دیگر مسلمان مدعیوں (parties) کی صورت میں محمڈن لا اور ہندو مدعیوں (parties) کی صورت میں ہندو لا کو (بہ شرطے کہ یہ قوانین کسی قانون سازی کے ذریعے تبدیل یا منسوخ نہ ہو گئے ہوں) ترجیح حاصل تھی۔ جب مروّجہ طریقوں کو ترجیحاً فیصلہ کن اختیار حاصل ہوا تو ان کو اسلامی قانون پر برتری حاصل ہو گئی۔[۶]

مسلم فوج داری اور دیوانی قوانین کی مکمل منسوخی

۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکومت کا تسلط مضبوط ہوا اور جیسے جیسے برطانوی دور حکومت کا نظامِ قضا قائم ہوتا گیا، ان علاقوں میں رواج پذیر قوانین خالص شرعی قوانین کی جگہ لیتے چلے گئے۔ ان مروّجہ طریقوں / قوانین میں عائلی و خاندانی زندگی سے متعلق بہت سے رواج اور طور طریقے اسلامی تعلیمات سے اور خصوصاً عورتوں کے

۴- سیّد امیر علی، **قانون شرع محمدی**، لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۹۰ء، ص ۳۸-۴۰

Rashida Patel, *Women and Law in Pakistan,* (Karachi: Faiza Publishers, 1972)

۵- رشیدہ پٹیل، نفس مرجع، ص ۳

۶- نفس مرجع، ص ۲

اسلامی حقوق سے متصادم تھے۔ نتیجتاً یہ صورتِ حال مسلمانوں کے خانگی اور معاشرتی ڈھانچوں پر آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتی چلی گئی اور اسی طور پر روّیے تشکیل پاتے گئے۔ بعد ازاں برطانوی حکومت کے تحت مختلف مدوّن قوانین بہ تدریج مروّجہ اور مذہبی قوانین کو منسوخ کرتے گئے۔ ۱۸۶۰ء میں پینل کوڈ آف انڈیا باضابطہ طور پر ہندوستان کے فوج داری قانون کے طور پر نافذ ہوا، جس نے مسلمانوں کے فوج داری قانون کو مکمل طور پر منسوخ کر دیا۔ ۱۸۷۲ء میں قانونِ شہادت، ۱۸۷۲ء کا قانونِ معاہدہ، ۱۸۷۵ء کا میجارٹی ایکٹ (Majority Act) نافذ ہوا اور ۱۸۹۹ء میں ضابطہ فوج داری اور ۱۹۰۸ء میں ضابطہ دیوانی کے نفاذ سے تمام فوج داری اور دیوانی معاملات کے حوالے سے شرعی احکامات منسوخ ہو گئے۔ البتہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کو اپنی تہذیب کے مطابق اپنے شخصی قوانین پر عمل درآمد کی اجازت دی گئی۔[۷]

نئے عائلی قوانین کی تشکیل کے مقاصد اور اثرات

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کام یابی کے بعد انگریز نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جن میں مسلم و غیر مسلم یگانگی کو ختم کرنے کے لیے قدیم اصول ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' پر عمل کے ساتھ زبان کی تبدیلی، تعلیمی نظام کی تبدیلی اور ملکی قوانین کی تبدیلی کے حربے استعمال کیے۔ البتہ اس کے ساتھ عمومی انصاف کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی قوانین سازی کی گئی۔

ہندوستان میں آباد مختلف قوموں / فرقوں کے باہمی معاملات کے حوالے سے شادی اور طلاق سے متعلق مختلف قوانین وضع کیے گئے۔[۸] ان مختلف اقوام اور فرقوں کے ہاں شخصی اور دیگر قوانین مدوّن اور مفصل حالت میں موجود نہیں تھے۔ خود ہندو مذہب میں شخصی قوانین، دیوانی اور فوج داری قوانین کے بہت سے معاملات میں تفصیلی قانونی آرا موجود نہیں تھیں۔ مختلف مذہبی آرا کے مطابق بنیادی انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق میں بھی انصاف کا فقدان تھا۔ خواتین کے حقوقِ ملکیت، حقِ وراثت، دوسری شادی کا حق اور دیگر معاملات میں خود برطانوی

۷- رشیدہ پٹیل، مرجع سابق، ص ۳

۸- شادی اور طلاق سے متعلق جو مختلف قوانین مدوّن اور نافذ ہوئے ان میں ہندو بیوہ کی دوبارہ شادی کا ایکٹ ۱۸۵۶ء، طلاق ایکٹ ۱۸۶۹ء، Christian Marriage Act, 1872، Special Marriage Act 1872، غیر ملکی نکاح ایکٹ ۱۹۰۳ء، آنند نکاح ایکٹ ۱۹۰۹ء، پارسی نکاح اور طلاق ایکٹ ۱۹۳۶ء Arya Marriage Validation Act, 1937 اور Hindu Marriage Disabilities Removal Act,1946, شامل تھے۔ دیکھیے: رشیدہ پٹیل، مرجع سابق، ص ۴

قانون میں اس وقت تک مسلمہ حقوق موجود نہیں تھے۔ جب کہ اسلامی فقہ میں نکاح، طلاق، وصیت، ہبہ اور ان سے متعلق بہت سے امور تفصیلاً درج تھے نیز خواتین کے معاشی و معاشرتی حقوق بھی مستحکم تھے۔ چنانچہ خواتین کے حقوق کے حوالے سے ہندو شادی شدہ خاتون کی پراپرٹی، علاحدہ رہائش، نان نفقہ اور بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق قوانین نافذ کیے گئے۔[۹] ان میں سے بیشتر قوانین حقیقی پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے بھی مدون کیے گئے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کے بیشتر عائلی معاملات فقہی تدوین کی شکل میں موجود تھے لیکن انہیں بھی باضابطہ قوانین کی شکل دی گئی۔ جو قوانین مسلمانوں سے متعلق ہیں، ان میں گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ (Guardian and Wards Act) ۱۸۹۰ء، مسلمان اوقاف ایکٹ ۱۹۲۳ء، بندش بچگانہ شادی ایکٹ ۱۹۲۹ء، مسلم پرسنل لا شریعت اپلی کیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء، مسلم تنسیخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء شامل ہیں۔ ذیل میں ان میں سے اہم قوانین کا تفصیلی جائزہ، مقاصد، طریقۂ کار اور اثرات کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے۔

مسلم پرسنل لا ایکٹ (۱۸۸۷ء-۱۹۳۶ء) اور مسلم پرسنل لا شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کے نفاذ اور مقاصد کا جائزہ جیسا کہ اوپر کی سطور میں بیان کیا گیا۔ قانون کی تبدیلی کے لیے تدریجی طریقہ استعمال کیا گیا۔ مسلمان جو اپنے اسلامی قوانین کو دین و ایمان کا حصہ بلکہ ضابطہ ٔ حیات تسلیم کرتے تھے، انہیں اس کا یکایک نسخ قابل قبول نہ ہوتا، چنانچہ بہ ظاہر اسلامی قانون نافذ رہا مگر آہستہ آہستہ اس کی روح، حدود و خصائص اور بہت سی اسلامی سزائیں موقوف ہو گئیں۔ ہندو مسلم اختلافات کی خلیج کو بڑھانے کے لیے ۱۸۶۷ء کے لگ بھگ ملک میں علاحدہ علاحدہ مسلم عدالتیں اور غیر مسلم عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ بہ ظاہر یہ مثبت تصور پیش کیا گیا کہ مسلمان اپنے معاملات مسلم عدالتوں میں لے جائیں اور غیر مسلم اپنے معاملات غیر مسلم عدالتوں میں۔ نتیجتاً بہت سے باہمی معاملات میں اس حوالے سے اختلافات پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۵ء میں الگ الگ عدالتیں ختم کر کے مسلم و غیر مسلم سب کے لیے ایک ہی مشترکہ عدالتیں قائم کر دی گئیں اور حاکموں کے انتخاب و تقرر میں **تعزیراتِ ہند** کے مطابق مسلم و غیر مسلم حکام مشترکہ طور پر مقرر کیے جانے لگے۔ چونکہ مسلمانوں کے بہت سے مسائل میں مسلم حاکم کا فیصلہ کرنا ضروری تھا اس لیے مسلمانوں کی مخالفت اور شریعت ایکٹ کے مطالبے پر قاضی ایکٹ بنا کر "شرعی قاضی" مقرر کیے گئے اور پھر ۱۸۸۷ء میں قاضی ایکٹ منسوخ کر کے مسلم پرسنل لا ایکٹ قائم کر دیا گیا۔ اور صرف نکاح و طلاق وغیرہ کے

۹- خواتین کے چند اہم حقوق کے تحفظ کے لیے قوانین وضع کیے گئے۔ ان میں شادی شدہ خاتون کی پراپرٹی سے متعلق ایکٹ ۱۸۷۴ء، ہندو بیوہ کی دوبارہ شادی کا ایکٹ ۱۸۵۶ء، ہندو عورت کا حق پراپرٹی / ملکیت ایکٹ ۱۹۳۷ء، اور ہندو شادی شدہ عورت کی علاحدہ رہائش اور نان نفقہ کا حق ایکٹ ۱۹۴۶ء شامل تھے۔ دیکھیے: رشیدہ پٹیل، مرجع سابق، ص ۴

اندراج کے لیے جگہ جگہ رسمی قاضی مقرر کر دیے گئے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی مخالفت کو درِ خور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ۱۸۸۷ء سے ۱۹۳۶ء تک مسلم پرسنل لا ایکٹ کا نفاذ رہا اور جمعیت علما کے علما مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں شریعت ایکٹ مسلم پرسنل لا کی شکل میں نافذ کیا گیا۔[۱۰]

یہ ایکٹ شمال مغربی سرحدی صوبے (NWFP) کے علاوہ تمام انڈیا میں نافذ کیا گیا تھا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں پہلے ہی ۱۹۳۵ء سے شریعت ایکٹ وسیع تر دائرہ کار میں نافذ تھا۔

متعلقہ ایکٹ کے سیکشن ۲ میں بیان کیا گیا کہ رسم و رواج اور معمول کے بالمقابل تمام ایسے معاملات میں، جو غیر وصیت شدہ جائیداد (سوائے زرعی زمین کے)، خواتین کی مخصوص ملکیت (ذاتی، ورثہ، ہبہ کردہ)، نکاح، طلاق، ایلا، ظہار، لعان، خلع، مبارات، مہر، ولایت، ہبہ، ٹرسٹ اور ٹرسٹ کی ملکیت اور وقف وغیرہ سے متعلق ہوں گے، مسلمان، مسلم پرسنل لا کے تابع ہوں گے۔[۱۱]

مسلم پرسنل لا شریعت اپلی کیشن ایکٹ کے اثرات

۱۸۶۲ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کے فوج داری قوانین کا مکمل خاتمہ کر کے انڈین پینل کوڈ نافذ کیا جو آج بھی انڈیا میں اسی نام سے موسوم ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد معمولی تبدیلیوں کے ساتھ پاکستان پینل کوڈ کے نام سے نافذ العمل ہے۔ اسلامی شریعت کا وہ حصّہ جس کا تعلق شخصی اور خاندانی معاملات سے تھا، اسے مسلم پرسنل لا کے نام سے ملک کے قانون کا حصّہ بنایا گیا۔ یوں انگریز اس خطے میں اسلامی شریعت کو منقسم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ درحقیقت یہ وہ سازش تھی جس کا کماحقہ ادراک شاید آج تک مسلمانوں کو نہیں ہو سکا کہ اس طرح انگریز نے اسلام جیسے کامل اور جامع مذہب کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا اور اسلامی شریعت کا دائرہ صرف گھر اور خاندان تک محدود کر دیا۔ گویا دیگر معاشرتی، معاشی، تجارتی اور ریاستی امور سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کا یہی محدود تصور آج بھی ذہنوں میں موجود ہے، چنانچہ جب اسلام بہ حیثیت ایک جامع نظامِ حیات کے تحت اسلامی قوانین کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں اور امور سے قائم کرنے کی آواز اٹھائی جاتی ہے تو غیر مسلم تو غیر مسلم خود مسلمان اس آواز کو اجنبی محسوس کرتے ہیں بلکہ اسی سازش کے پروردہ بن کر اس کے خلاف اپنی آواز بھی شامل کرتے ہیں۔

۱۰- مفتی نظام الدین "مسلم پرسنل لاء تاریخ کے مختلف مرحلوں میں" خصوصی اشاعت **مسلم پرسنل لا، دارالعلوم نمبر**، مارچ-اپریل ۱۹۸۲ء، ص ۳۳تا۳۵

11 - Patel, op.cit., 7 ; M. Mahmood, *The Code of Muslim Family Laws*, (Lahore: Al-Qanoon Publisher, 2007), 691

اسلام کے جن قوانین اور اصولوں کو شخصی اور خاندانی زندگی میں نافذ کرنے کی آزادی دی گئی تھی انہی کو قانون کی کتابوں میں مسلمانوں کے خصوصی قوانین کا نام دیا گیا اور قانون دان طبقے میں یہ مسلم پرسنل لا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ مسلم پرسنل لا کا دائرہ جن امور تک محدود تھا، ان میں دارالافتا کے فتوے کے مطابق فیصلہ دیا جاتا تھا۔(۱۲) شروع میں عدالتوں میں قاضی مقرر کیے گئے جو اسلامی قانون نافذ کرتے تھے، اس کے بعد اس نظام کو ختم کر کے عام عدالتوں کو پابند کر دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے عائلی مسائل ان کی مذہبی کتابوں کے مطابق طے کریں۔ پریوی کونسل نے اپنی زیریں عدالتوں کو ایک حکم نامے کے تحت حکم دیا کہ وہ فقہا اور علما کی توضیحات و تشریحات کے مطابق ہی فیصلہ کریں، خود قرآن و حدیث کی تشریح نہ کریں۔ اس لیے عدالتیں **ہدایہ** اور **شامی** کے حوالے سے فیصلے کرنے لگیں۔(۱۳) انگریزوں کی آمد سے قبل عالم گیر کے وضع کردہ قانون **فتاویٰ عالمگیری / فتاویٰ ہندیہ**، جس کی بنیاد قرآن و حدیث اور اکابر اسلام کے فتاویٰ پر تھی، قانونی حیثیت رکھتی تھی۔ اس دور میں وہ بھی ایک تاریخی دستاویز کے طور پر مرجع قانون کی حیثیت اختیار کر گئی۔

اس دوران میں مسلم عدالتوں میں جو قانون نافذ کیا گیا اس کو اسلامی قانون کہتے ہوئے اس کا نام محمڈن لا رکھا گیا۔ حالانکہ اسلامی قوانین کو محمڈن لا کہنا غلط تھا کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوانین حضور اکرم ﷺ کے بنائے ہوئے ہیں؛ حالانکہ یہ قوانین اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں۔ پھر اسلامی قوانین میں صحیح اور غلط تعبیروں کے ساتھ دیے گئے فیصلے عدالتی نظائر کے طور پر شامل ہونے لگے اور یوں اینگلو محمڈن قانون وجود میں آیا جو صحیح معنوں میں اسلامی قانون نہیں تھا۔ پاکستان کے مشہور قانون دان اے-کے بروہی رقم طراز ہیں:

> "The law that was applied by the British Indian Court was not Muslim Law stricto sensu but was, what may be characterized as, a cross-breed, a hybrid, resulting from the interaction of the principles of Muslim Law with the rules of Muslim Law as they were adopted and applied by the British Indian Courts pursuant to the powers conferred on them by several legislative enactments defining their powers and jurisdiction to apply

---

۱۲- اسیر ادروی، "مسلم پرسنل لا کیا ہے"، خصوصی اشاعت، **مسلم پرسنل لا، دارالعلوم نمبر**، مارچ-اپریل ۱۹۸۶ء، ص ۳۸

۱۳- عزیز اللہ اعظمی "مسلم پرسنل لا-ماضی و حال کے آئینے میں"، **دارالعلوم نمبر، خصوصی اشاعت**، مارچ-اپریل ۱۹۸۶ء، ص ۴۷

Muslim Law in the determination of controversies before them..."[۱۴].

وہ قانون جو کہ برطانوی ہند کی عدالتوں نے لاگو کیا تھا وہ متعین مفہوم میں اسلامی قانون نہ تھا بلکہ اس کو ایک مخلوط اور امتزاجی قانون کہا جاسکتا ہے جو کہ حقیقی اسلامی قانون کے اصولوں اور اس اسلامی قانون کے تلازم کے نتیجے میں وجود پذیر ہوا تھا جو برطانوی ہند کی عدالتوں میں نافذ تھا۔ اسلامی قانون کے ان اصولوں کو برطانوی ہند کی عدالتوں کو متعدد قانون سازیوں کے ذریعے دیے گئے اختیارات کی روشنی میں اختیار اور لاگو کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان عدالتوں کو ان کے سامنے پیش ہونے والے تنازعات کا اسلامی قانون کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا اختیار سماعت بھی دیا گیا۔

لارڈ وارن ہیسٹنگ کے عہد (۱۷۷۵ء تا ۱۷۸۵ء) میں **ہدایہ** اور پھر **فتاویٰ عالمگیری** کا انگریزی میں ترجمہ ہوا، جس نے انگریز جج صاحبان کو مسلمانوں کے متعلقہ معاملات کے فیصلے میں مدد دی۔ بعد ازاں ۱۹۱۱ء میں جسٹس عبدالرحیم نے -**پرنسپلز آف محمڈن جورس پروڈنس**، اور سیّد امیر علی، نے جو پریوی کونسل کے پہلے ہندوستانی جج تھے **محمڈن لا** مدون کیا۔ بمبئی ہائی کورٹ کے جج جسٹس ملاّ (Mulla) نے Principles of Mohammedan Law مدون کیا جو اسلامی سول لا میں مستند حیثیت رکھتا ہے۔[۱۵] ملا نے نہایت امانت داری سے مسلمانوں کے مسائل، حوالہ جات اور تشریحات کے ساتھ مدون کر کے عدالتوں کا کام آسان کر دیا۔ ان ہی محدود و مختصر عائلی مسائل کا نام مسلم پرسنل لا پڑ گیا۔

مسلم پرسنل لا شریعت اپلی کیشن ایکٹ (Muslim Personal Law (Shariat) Application Act) کے نفاذ میں ایک پہلو خواتین کے حقوق سے متعلق بھی تھا۔ ہندو معاشرے میں عورت ظلم اور استحصال کا شکار تھی اور برطانوی قانون سازی کے اصولوں کے مطابق بہت سے عائلی معاملات میں رواج کو اسلامی شریعت پر ترجیح دی جاتی تھی؛ چنانچہ ایسی صورت حال میں ایک مسلمان خاتون وہ حقوق حاصل کرنے سے قاصر تھی جن کی ضمانت اسلام دیتا ہے۔ پاکستان کی مشہور قانون دان اور اپوا(All Pakistan Women's

---

۱۴- رشیدہ پٹیل، مرجع سابق، ص ۷

A.K.Barohi, *Fundamental Law of Pakistan*, (Karachi: Deen Muhammad Press, 1958, 776

۱۵- محمد افضل چیمہ، "عمل قانون سازی"، **فکر و نظر**، اسلام آباد، ج ۴۲، ش ۲، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۵

Association) کی اہم ذمّہ دار رشیدہ پٹیل صاحبہ ایکٹ کے نفاذ کے ضمن میں لکھتی ہیں کہ "مسلمان خواتین نے مسلم پرسنل لا (شریعت) کے نفاذ کا خیر مقدم کیا؛ کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ پرسنل لا کا نفاذ انہیں اس مقام کے حصول کی ضمانت دے گا جس کی وہ اسلام کی رُو سے حق دار ہیں"۔[۱۶]

مسلمانوں کے باضابطہ عائلی قوانین کے نفاذ سے مسلمان عورت کو تحفظ میسر آیا، البتہ زرعی زمین سے متعلق معاملات کو اس ایکٹ کے دائرہ اثر سے باہر رکھنے، اور وراثت میں بھی اس کا اطلاق صرف غیر وصیت شدہ جائداد تک محدود رکھنے کے باعث وراثت کے ضمن میں شرعی احکامات پر عمل نہیں ہو پا رہا تھا اور خصوصاً مسلمان خواتین وراثت میں اپنے جائز حق کے حصول سے محروم رہیں؛ کیوں کہ قانونِ رواج کے مطابق جدی جائداد میں بیٹیوں کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا تھا۔[۱۷] یوں یہ ایکٹ مکمل طور پر مسلمان عورت کو مروّجہ طریقوں کے بالمقابل اسلام کے عطا کردہ حقوق دینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شریعت ایپلی کیشن ایکٹ (Shariat Application Act) میں ایک دفعہ تنسیخِ نکاح بہ ذریعۂ عدالت سے متعلق بھی تھی جو بعد میں تنسیخِ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء کے ذریعے کالعدم قرار دے دی گئی۔

متعلقہ ایکٹ کے آزادیٔ ہند کے بعد اثرات کا جائزہ دیگر قوانین کے تعارف اور جائزے کے بعد پیش کیا جائے گا۔

مسلم تنسیخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء (Dissolution of Muslim Marriage Act) کے نفاذ اور مقاصد کا جائزہ

اسلام نے زوجین کے درمیان عدمِ اتفاق کی صورت میں اور اصلاحِ احوال کی تمام کوششوں کی ناکامی کے بعد بہ تقاضائے ضرورت آخری چارۂ کار کے طور پر طلاق کا طریقہ مقرر فرمایا اور اس اہم اور نازک فیصلے کا اختیار مرد کے سپرد کرتے ہوئے اس کے استعمال کے لیے حدود بھی متعین کر دیں تاکہ اس سے تجاوز نہ کیا جا سکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تنسیخِ نکاح کا یہ اختیار مرد کو ترجیحِ اوّل کے طور پر دیا گیا ہے جب کہ عورت کی طرف سے نافرمانی ہو یا شوہر یہ سمجھتا ہو کہ وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں رہتے ہوئے حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ بہ صورتِ دیگر اگر شوہر زیادتی کا مرتکب ہو، یا عورت یہ محسوس کرے کہ اس کے حقوق شوہر کی طرف سے ادا نہیں ہو رہے تو عورت

۱۶- رشیدہ پٹیل، مرجع سابق، ص۶

۱۷- رشیدہ پٹیل، مرجع سابق، ص۷ ؛ افضل چیمہ، حوالۂ سابق، ص ۱۲۵

کو تنسیخِ نکاح کا یہی حق خلع کے حصول، تنسیخ نکاح بہ ذریعہ قاضی (عدالت) اور حقِ تفویض طلاق کے ذریعے عطا کیا گیا ہے۔

حنفی مذہب میں اس کے لیے بہترین طریقہ، تفویضِ طلاق کا ہے۔ اگر نکاح کے آغاز ہی میں اس طریقے کو اختیار کر لیا جائے تو ایسے حالات میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہو سکتی؛ لیکن چوں کہ اس دور میں شرعی احکام سے ناواقفیت عام ہو چکی تھی، اس لیے عام طور پر لوگ نکاح کے وقت شریعت کی دی ہوئی اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے اور آگے چل کر خواتین مشکلات کا شکار ہو جاتی تھیں۔ ایسی خواتین جنھوں نے نکاح کے وقت تفویضِ طلاق کے طریقے کو اختیار نہ کیا ہو، اگر بعد میں کسی شدید مجبوری کے تحت شوہر سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہتیں، مثلاً شوہر اتنا ظالم ہو کہ نہ نفقہ دیتا ہو نہ آباد کرتا ہو، یا وہ پاگل ہو جائے یا مفقود الخبر ہو جائے، یا نامرد ہو اور از خود طلاق یا خلع پر آمادہ نہ ہو، تو اصل حنفی مسلک میں ان معاملات کی تفصیلات کم درج تھیں۔ خصوصاً ان مقامات پر جہاں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے والا کوئی قاضی موجود نہ ہو۔[۱۸]

چونکہ برطانوی قانونی نظام کے تحت اس وقت تک مسلم اور غیر مسلم عدالتیں اکٹھی کر دی گئی تھیں اور برطانوی ہند کی عدالتیں بھی حنفی مسلک کا یہی موقف اپناتی تھیں کہ ایک عورت ان معاملات میں عدالت کے ذریعے اپنا نکاح فسخ نہیں کروا سکتی۔[۱۹] اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ بعض صورتوں میں مسلم خواتین نے مردوں کے ظلم سے نجات کے لیے ارتداد کی راہ اپنائی کیوں کہ عوام الناس میں یہ گمان کیا جاتا تھا کہ زوجین میں سے کسی فریق کے ارتداد سے نکاح خود بخود فسخ ہو جائے گا، اور عدالتیں بھی اسی اصول پر فیصلہ دیتی تھیں۔[۲۰]

اس تمام صورتِ حال کے ادراک کے ساتھ اس دور کے معروف عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی نے خواتین کو مردوں کی طرف سے پہنچنے والے مصائب اور نتیجتاً خواتین کے ارتداد کے واقعات کا نوٹس لیا۔ انہوں نے ایسے بیشتر معاملات، جن کے بارے میں فقہ حنفی میں مسائل کم درج تھے یا عملاً ناقابل عمل تھے، مثلاً سرکش بیوی، عنین، مجنون اور لاپتا آدمی کی بیوی سے متعلقہ مسائل، مالکی مذہب کے مطابق فتویٰ دیا۔ اس کے لیے انھوں نے پہلے مالکی کتب سے تفصیلات جمع کیں، پھر حجاز میں مقیم مالکی علما سے خط و کتابت کے ذریعے احکامات کی جزوی

۱۸- اشرف علی تھانوی، حیلۂ ناجزہ یعنی عورتوں کا حقِ تنسیخ نکاح **(مع جدید اضافات)**، کراچی، دارالاشاعت، ۱۴۰۷ھ، ص ۹-۱۴

۱۹- رشیدہ پٹیل، مرجع سابق، ص ۱۱۵

۲۰- نفس مرجع

تفصیلات معلوم کیں اور پھر اس پر پورے ہندوستان کے علما سے تصدیقات حاصل فرمائیں اوراس مجموعہ کو **الحیلة الناجزة** (خواتین کا حقِ تنسیخ نکاح) کے نام سے شائع فرمایا"۔[۲۱]

اس کتاب میں فقہ حنفی کی رُو سے بوقتِ نکاح تفویضِ طلاق، عدالت کے ذریعے فسخ نکاح کی وجوہات اور ارتداد کی صورت میں نکاح کی تنسیخ / عدم تنسیخ پر سیر حاصل بحث کی گئی اور علما کرام اور قانون دان حضرات سے استدعا کی گئی کہ وہ ان فتاویٰ / فقہی آرا کو قانونی شکل دلوانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ چنانچہ علمائے کرام کی کوششوں سے ۱۹۳۹ء میں مسلمانوں کا تنسیخِ نکاح کا قانون منظور ہو گیا۔ اس قانون کے نفاذ کے طویل عرصے بعد مسلم خاتون کا حقِ تنسیخ نکاح بحال ہوا اور اسے رواج اور دستور یا مقامی قوانین کے اثرات سے نجات ملی۔

قانون مسلم تنسیخ نکاح ۱۹۳۹ء کے تحت عورت کو جن بہت سی وجوہ کے تحت تنسیخ نکاح کا دعویٰ کرنے کا حق دیا گیا تھا، ان میں ۴ سال سے لاپتا شوہر، ۷ سال کے لیے سزا یافتہ شوہر، دو سال تک نان نفقے سے محرومی اور شوہر کی طرف سے نظر انداز کیا جانا، عرصہ ۳ سال تک بلاوجہ ازدواجی فرائض کی عدم ادائگی، شادی کے وقت اور بعد میں شوہر کی نامردی [غیر فعالیت]، کم عمری میں کی گئی شادی، بیوی کے ساتھ ظلم و زیادتی کا سلوک، بیوی کو غیر اخلاقی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا اور اسے مذہبی ذمہ داریوں کی ادائگی سے روکنا، متعدی یا جنسی بیماری میں مبتلا ہونا، بیوی کے اموال کو ضائع کرنا، اور دو بیویوں کی موجودگی میں عدم مساوات وغیرہ شامل تھیں۔ نیز اس قانون کی دفعہ ۲ (۹) کے تحت شرعی طور پر تسلیم شدہ کوئی بھی وجہ تنسیخِ نکاح کی بنیاد بن سکتی ہے۔

اسی قانون کے تحت خیارِ بلوغ کا حق بھی ۱۸ سال کی عمر پر پہنچنے تک استعمال کیا جا سکتا ہے بہ شرطے کہ تعلق زن و شوہر قائم نہ ہوا ہو۔ خلع کی بنیاد پر تنسیخِ نکاح کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ اس قانون کے ذریعے تنسیخِ نکاح کی صورت میں کسی عورت کے حقِ مہر یا اس کے کسی اور حق پر، جو اسے اسلامی قانون کے تحت حاصل ہے، کوئی اثر نہیں پڑتا۔

متعلقہ قانون کے تحت اہم ترین امر امام مالکؒ کے مذہب کی اتباع میں عورت کا فسخِ نکاح کا وہ حق تھا جو اس کے شوہر کے چار سال تک لاپتا رہنے کی صورت میں اس کو دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے فقہِ حنفی کی رو سے لاپتا شوہر کے لیے عورت ۸۰، ۹۰ سال تک انتظار کی پابند تھی۔

۲۱- اشرف علی تھانوی، مرجع سابق، ص۹-۱۰

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس قانون کے تحت خیارِ بلوغ کا حق بھی ۱۸ سال کی عمر پر پہنچنے تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے سوا حنفی علما کا اس پر اتفاق ہے کہ باپ اور دادا کے علاوہ اگر کسی دوسرے ولی نے نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کیا ہو تو وہ (نابالغ یا نابالغہ) بالغ ہونے پر خیارِ بلوغ کا حق استعمال کر کے اس نکاح کو، جو ان کے ولی نے اس کے نابالغ ہوتے وقت کیا ہو، رد کر سکتے ہیں۔[۲۲]

شیعہ کے ائمہ کے نزدیک بھی باپ دادا کے کیے ہوئے نکاح میں خیارِ بلوغ کا حق استعمال نہیں کیا جا سکتا، البتہ کسی ولیِ ابعد (دور کے سرپرست) کے کیے گئے نکاح کو باپ یا دادا کی اجازت پر موقوف رکھا گیا ہے۔[۲۳]

مالکیہ کے نزدیک صرف باپ اور شافعیہ کے نزدیک صرف باپ اور دادا کو ولایتِ نکاح حاصل ہے۔ چنانچہ ان اولیا کے علاوہ کسی اور کا کیا گیا نکاح جائز ہی نہیں اور ان میں خیارِ بلوغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[۲۴]

حنفی مکتبِ فکر میں اگرچہ تمام ائمہ کا اس امر میں اتفاق ہے کہ باپ اور دادا کے کیے ہوئے نکاح میں خیارِ بلوغ بطور مجرد حق کے استعمال نہیں کیا جا سکتا، جس کی بنیادی وجہ ان اولیا کی شفقت اور ولایتِ کاملہ اور اولاد کے لیے مصلحت پر مبنی فیصلے ہیں؛ البتہ فقہا نے ایسی صورت میں اولیا کے غیر امین، فاسق اور لاپرواہ ہونے یا نکاحِ غیر کفو یا غبن فاحش ہونے کی بنا پر بھی نابالغ کو بعد از بلوغ نکاح فسخ کرنے کا اختیار دیا ہے۔[۲۵]

اس سلسلے میں ایک بحث خیارِ بلوغ کے ذریعے نکاح کے فسخ ہونے میں عدالت کے اختیار سے متعلق بھی تھی۔ تمام فقہائے کرام کا اس پر اتفاق تھا کہ محض زوجین میں سے کسی ایک کے خیارِ بلوغ کا حق استعمال کر لینے سے نکاح خود بخود فسخ نہیں ہو جاتا بلکہ عدالت کے حکم پر موقوف ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر خیارِ بلوغ کے حق کے استعمال کے بعد عدالتی ڈگری حاصل ہونے سے پہلے دو میں سے کوئی ایک مر جائے تو ایک دوسرے کا وارث ہو گا۔ اس مضمون

۲۲- تنزیل الرحمن، **مجموعۂ قوانین اسلام**، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ط ۳، ۱۹۸۷ء، ج ۱، ص ۲۳۱، بہ حوالہ **فتاویٰ قاضی خان**، ج ۱، کتاب النکاح، ص ۱٦٦

۲۳- نفس مرجع، ج ۱، ص ۲۳۲، بہ حوالہ **شرائع الإسلام**، کتاب النکاح، طہران، ص ۱۷۵

۲۴- تنزیل الرحمن، مرجع سابق، ج ۱، ص ۲۳۲

۲۵- تنزیل الرحمن، نفس مرجع، ج ۱، ص ۲۳٦، بہ حوالہ **رد المختار**، مصر، ج ۲، ص ۳۱۲-۳۱۳؛ **البحر الرائق**، باب الکفاءۃ، مصر، ج ۳، ص ۳۱۳-۳۱۴

کی تائید قاضی خان، صاحب مجمع الانہر اور امام سرخسی نے کی ہے اور اسی قسم کا مضمون **تبیین الحقائق**، **محیط** ، **ملتقی الأبحر** اور **فتح القدیر** میں بھی درج ہے۔[۲۶]

اس تمام بحث کو درج کرنے کا مدعا یہ ہے کہ مذکورہ قانون کی تدوین و نفاذ سے قبل غیر منقسم ہندوستان میں باپ اور دادا کے کیے ہوئے نکاحوں کو خیارِ بلوغ کا حق استعمال کر کے فسخ نہیں کرایا جاسکتا تھا، لیکن مسلم تنسیخِ نکاح قانون ۱۹۳۹ء کے مطابق جب شرعی قانون کے احکام کو، مرتب کیا گیا اور ان کی توضیح کی گئی تو دفعہ ۲ کی ذیلی دفعہ (۷) کے تحت ایسی عورت کو، جس کا نکاح اس کے باپ، دادا یا کسی دوسرے ولی نے کیا ہو، خیارِ بلوغ کے ذریعہ تنسیخِ نکاح کی ڈگری حاصل کرنے کا حق دار قرار دیا گیا، جس کے نتیجے میں باپ، دادا اور دوسرے اولیا کے کیے گئے نکاحوں کے درمیان خیارِ بلوغ کے حق کے سلسلے میں عدالتی فیصلوں میں جو تفریق پائی جاتی تھی، وہ اس قانون کے سبب سے ختم ہو گئی۔[۲۷]

اس سلسلے میں دوسری بحث یعنی خیارِ بلوغ کا عدالتی ڈگری کے ذریعے نافذ ہونا اگرچہ اس قانون کے ذریعے طے پا گیا تھا، تاہم بعد ازاں ہندو پاکستان کی عدالتوں میں اس حوالے سے مختلف نظائر سامنے آئے۔ ڈاکٹر تنزیل الرحمن نے ***مجموعۂ قوانین اسلام*** کی جلد اوّل میں قانون ازدواج کے تحت بہت سے عدالتی فیصلوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں جج صاحبان نے یہ فیصلہ دیا کہ خیارِ بلوغ کے حق کے استعمال کو جواز بخشنے کے لیے عدالت کے حکم کی ضرورت نہیں اور ان معاملات میں لڑکی کے بالغ ہونے پر دوسرے آدمی سے اپنا نکاح خود کر لینے کو استرداد (Repudiation) کا طریقہ تسلیم کیا۔[۲۸] یہ قانون پاکستان میں بھی اسی شکل میں نافذ العمل ہوا۔ جس میں چند ترامیم مسلم فیملی لا آرڈیننس ۱۹۶۱ء کے ضمن میں کی گئی ہیں۔

۲۶- نفس مرجع، ص ۲۴۳-۲۴۷ بہ حوالہ ***فتاویٰ قاضی خان***، کتاب النکاح، ***فتاوی ہندیہ***، ج ۱، ص ۱۶۶، **مجمع الأنہر**، مصر، کتاب النکاح، باب الأولیاء، والأکفاء، ج ۹، ص ۳۳۷، ابن ہمام، **فتح القدیر**، **شرح ہدایۃ**، مطبوعہ مصر، ج ۲، ص ۴۱۱، امام سرخسی، **المبسوط**، مصر، ج ۴، **باب النکاح**، الصغیر والصغیرۃ، ص ۲۱۲- ۲۲۷

۲۷- تنزیل الرحمن، مرجع سابق، ج ۱، ص ۲۴۳

۲۸- نفس مرجع، بحث بہ سلسلہ خیارِ بلوغ، عدالتی نقطۂ نظر، ج ۱، ص ۲۵۳-۲۶۲

مسلم تنسیخِ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء کے اثرات

متعلقہ قانون سازی مولانا اشرف علی تھانوی کی کوششوں کا نتیجہ تھی اور اس سلسلے میں حنفی مسلک کے علاوہ مالکی آرا کو اختیار کیا گیا۔ مولانا نے اس سلسلے میں جو فتاویٰ دیے اور جن پر دیگر علمائے ہند سے تصدیقات حاصل کیں، ان میں ایک موضوع خود ضرورتِ شدیدہ میں دوسرے ائمہ کے مذہب پر فتویٰ دینا بھی تھا۔ **حیلۂ ناجزہ** میں جہاں تنسیخِ نکاح سے متعلق مختلف مباحث جمع کیے گئے وہاں حقِ تفویضِ طلاق، ارتداد کی صورت میں نکاح از خود فسخ نہ ہونے اور ایک مذہب پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دوسرے مذاہب کی طرف رجوع کرنے کے معاملے کو بھی زیرِ بحث لایا گیا۔

تالیفِ کتاب کی وجہ کے ضمن میں مولانا رقم طراز ہیں:

> رہا یہ کہ فقہ حنفی پر کسی کو عدمِ کفایت کا سوال ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود فقہِ حنفی میں بھی خاصی شرائط کے ساتھ ایسی ضرورت شدیدہ میں دوسرے مجتہد کے قول پر عمل کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے جیسا کہ علامہ شامی کے رسالہ **عقود رسم المفتی**، ص ۵۰ میں بحث مفید کے بعد مرقوم ہے۔ (دیگر حوالے بھی دیے گئے ہیں)۔ [۲۹]

تدوینِ قانون کی اکثر مثالیں جو مسلمانوں کے ہاں اس وقت تک موجود تھیں وہ سب کی سب اس بات پر شاہد تھیں کہ ملک کی اکثریت کا جو فقہی مذہب رہا، اسی مذہب کے مطابق قانون کو مدوّن کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسا نہیں ہوا کہ کتاب و سنت اور اجماع کو اساس قرار دے کر اس بات کی کوشش کی گئی ہو کہ فقہ اسلامی کے پورے ذخیرے میں سے وہ مسائل اخذ کر لیے جائیں جو کتاب و سنت سے زیادہ قریب نظر آتے ہوں۔[۳۰] البتہ بیسویں صدی میں تدوینِ فقہ کی باضابطہ کوششوں میں مختلف رجحانات سامنے آئے۔

بیسویں صدی میں اسلامی قانون کی ضابطہ بندی دیگر ممالک میں بھی جاری تھی۔ مصر، شام، مراکش اور اُردن میں شخصی قوانین مرتب اور نافذ کیے گئے۔ مصر میں ضابطۂ تنظیمِ عدالت ہائے شرعیہ ۱۹۱۰ء کے تحت شخصی معاملات میں امام ابو حنیفہؒ کے مفتٰی بہ اقوال پر عمل ہوتا تھا۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں قائم کردہ ایک خصوصی کمیشن کی سفارشات کو بہ حیثیت قانون نافذ کیا گیا جس کے ذریعے پہلے قانون میں ترمیم کرتے ہوئے نان نفقہ، عدت، لاپتا شوہر کے مسائل میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے مذاہب کے مطابق عمل کیا جانے لگا۔ بعد ازاں دیگر قوانین کے ذریعے طلاق، نان نفقہ، وراثت اور وقف و وصیت کے ضمن میں حنفی مذہب سے مغائر احکام پر عمل شروع ہوا۔[۳۱]

۲۹- اشرف علی تھانوی، مرجع سابق، ص ۱۴-۱۵

۳۰- امین احسن اصلاحی، **اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل**، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۶

۳۱- تنزیل الرحمن، مرجعِ سابق، ج ۱، ص ۹-۱۴

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی میں عالم اسلام میں فقہِ مقارن (تقابلی فقہ) کی ابتدائی کاوشوں کے ضمن میں برصغیرِ میں مسلم تنسیخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء پہلا قدم ثابت ہوا اور آئندہ کے لیے عدالتی فیصلوں اور قانون سازی میں حنفی مسلک کے علاوہ دیگر ائمہ کی آرا کی طرف رجوع کا رجحان پیدا ہوا، جس کے نظائر انڈیا اور پاکستان میں کئی پیش آمدہ عائلی معاملات میں سامنے آئے۔

البتہ تقسیم سے پہلے کی مشترکہ عدالتوں میں، جہاں قاضی علوم شریعت پر عبور رکھنے والے نہ تھے اور بعد ازاں ہندوپاکستان کی عدالتوں میں بھی یہی صورت حال برقرار رہی، اس کی وجہ سے پیشتر عدالتی نظائر میں جمہور فقہا کی آرا سے مختلف آراسامنے آئیں۔ نیز عدالتی نظائر کی حقانیت یا اس سے استفادے کا رجحان اتنا قوی ہو گیا کہ بہت سے فیصلے محض گزشتہ عدالتی نظائر کی روشنی میں طے پانے لگے، خواہ معاملے کی تفصیلات مختلف فیصلے کا تقاضا کرتی ہوں۔

گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ ۱۸۹۰ء (Guardian and Wards Act 1890) کے نفاذ اور اثرات کا جائزہ

گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے ۱۸۹۰ء میں نافذ کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ کے ذریعے ولایت اور حضانت کے معاملات کی ضابطہ بندی کی گئی۔ متعلقہ قانون کے ذریعے نابالغ بچوں کی ذات یا ان کے مال (ملکیت) کے حوالے سے ولی (Guardian) کا تعین کیا گیا۔ جب کہ میجارٹی ایکٹ (Majority Act) ۱۸۷۵ء کے مطابق ۲۱ سال کی عمر تک بچہ نابالغ تصوّر کیا جاتا ہے۔[۳۲] عمومی طور پر باپ بچے کا قدرتی ولی تصوّر کیا جاتا اور اس کی وفات کی صورت میں ماں بچے کی ولی ہوتی۔ اگر کسی معاملے میں زیر ولایت / نابالغ کے لیے کسی کی ولایت عدالت کی نظر میں درست نہ ہوتی تو متعلقہ عدالت کا سینئر جج اس کا حقیقی ولی تصور ہوتا اور وہ اپنی اس حیثیت میں اس کے مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے بہ شمول سوموٹو (suo moto) کوئی بھی حکم دے سکتا۔[۳۳]

یہ قانون درحقیقت ایک ضابطۂ عمل (Procedural Law) تھا اور اس میں قانونی تفاصیل نہیں تھیں۔ چوں کہ یہ ہندوستان کے تمام باشندگان پر منطبق ہوتا تھا، لہٰذا مسلمان فریقین کی صورت میں مسلم پرسنل لا کے مطابق مقدمات فیصل ہوتے۔

---

32 - M. Mahmood, *The Code of Muslim Family Laws*, 478

۳۳- نفس مرجع، ص۴۷۹، بہ حوالہ (PLD. 1995- Pesh.77)

شریعت نے بہت سے امور میں حقِ ولایت کو تسلیم کیا ہے اور مختلف حوالوں سے اولیا کے حقوق و فرائض کی نشان دہی بھی کر دی ہے، مثلاً نکاح کے لیے ولی، جنازہ کے لیے ولی، یتیموں کے مال کا ولی، نابالغ اولاد کا ولی وغیرہ اور ہر ایک کے الگ الگ ضابطے موجود ہیں۔ اسی طرح حضانت یعنی ماں باپ کے درمیان جدائی کی صورت میں بچے کی پرورش اور تعلیم کے حق کی وضاحت بھی فقہِ اسلامی میں موجود ہے۔

ماں اور باپ کے درمیان تفریق کی صورت میں حضانت (نابالغ کی پرورش و تربیت) کے حق کا فیصلہ اسلامی قانون کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ عمومی اصول کے مطابق لڑکے کی حضانت کا حق سات برس کی عمر کے آخر تک اور لڑکی کی حضانت کا حق، جب تک کہ وہ بلوغت کو نہ پہنچے، ماں کو حاصل ہے۔ بعد ازاں لڑکے کو ماں یا باپ میں سے کسی کے ساتھ رہنے کا اختیار ہے۔ البتہ اس تمام عرصے میں بچے کا ولی باپ ہی ہوتا ہے اور اسی پر بچوں کے نان نفقہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ماں کی وفات کی صورت میں یہ حق نانی، دادی، حقیقی بہن، خالہ، پھوپھی کو بالترتیب منتقل ہو سکتا ہے۔[۳۴] لیکن حضانت کے معاملات میں ولایت کے حق سے زیادہ، زیر ولایت نابالغ (minor) کے مفاد کو ترجیح دی جاتی ہے۔[۳۵]

متعلقہ قانون میں میجارٹی ایکٹ (Majority Act) ۱۸۷۵ء کے ذریعے ۲۱ سال کی عمر تک بچہ نابالغ تصور کیا جاتا تھا۔ یہ دفعہ اسلام کے تصورِ بلوغت سے متصادم تھی جہاں بلوغت کا انحصار لڑکے اور لڑکی کی مختلف صورتوں میں بلوغت کی نشانیوں پر ہوتا ہے؛ البتہ اکثر فقہا کے نزدیک اس کی زیادہ سے زیادہ حد ۱۵ سال ہے۔ چنانچہ مختلف معاملات میں ولی کے تقرر کے حوالے سے متعلقہ قانون کے تحت غیر منقسم ہندوستان میں جج ۲۱ سال کے مطابق معاملات طے کرتے تھے۔ پاکستان میں بعد ازاں ایک ترمیم کے ذریعے نابالغ کی عمر کی حد ۱۸ سال مقرر کر دی گئی۔

یہ قانون پاکستان میں بھی نافذ العمل ہے اور فیملی کورٹس ایکٹ ۱۹۶۴ء کے تحت فیملی کورٹس کو بلاشرکتِ غیرے نابالغوں کی حضانت کے معاملات کی سماعت کا اختیار ہے۔ ڈسٹرکٹ جج چاہے تو خود سماعت کرے اور چاہے تو مقدمات، بنائے دعویٰ (مقدمہ دائر کرنے والی خاتون) کی رہائش کے علاقے میں کسی کورٹ کو منتقل کر دے۔ بچوں کی حوالگی اور سرپرستی کے مقدمات کی بابت عائلی عدالتوں کا رجحان عموماً بیوی کے حق میں ہوتا ہے، لہذا

۳۴- ایم محمود، مرجع سابق، نفس مرجع، ایضاً، ص ۴۷۹، امام شوکانی، **الدرر البهية**، (ترجمہ حافظ عمران ایوب)، **فقہ الحدیث**، لاہور، نعمانی کتب خانہ، ۲۰۰۴ء، ج ۲، ص ۲۳۹-۲۴۲

۳۵- ایم محمود، مرجع سابق، ص ۴۸۴، بہ حوالہ (2005 YLR 547) (PLJ 2005 S.C.33) ودیگر

عدالت کارروائی اس مقام پر شروع کر سکتی ہے جہاں بیوی کی رہائش ہو۔[۳۶] نابالغ بچے اگر ماں کے ساتھ بھی رہ رہے ہوں تو مسلم فیملی لاز آرڈیننس کی دفعہ ۹ کے تحت باپ لڑکے کی بلوغت تک اور لڑکی کی شادی ہونے تک نان نفقہ ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یہ امر کہ ماں ملازمت کرتی ہو یا اس کے حالات اچھے ہوں، باپ کو نان نفقہ کی ادائیگی سے مبّرا نہیں کرتا۔[۳۷]

یہ قانون خصوصاً حضانت کے معاملات میں بہت فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔

بندش بچگانہ شادی ایکٹ ۱۹۲۹ء (Child Marriage Restraint Act 1929) کے نفاذ اور اثرات کا جائزہ

اس قانون کے ذریعے کم سنی کی شادی پر پابندی لگائی گئی اور چودہ سال سے کم عمر کی لڑکی سے شادی مستوجبِ سزا قرار دی گئی، البتہ ایسی شادی فسخ یا باطل قرار نہیں دی گئی۔[۳۸] نیز اس کے تحت کم سن لڑکی سے شادی کرنے والے مرد کے لیے سزا رکھی گئی اور خواتین کے لیے کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی۔ بچوں کی شادی میں ملوث متعلقہ والدین یا سرپرست کو بھی سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا۔[۳۹] یہ قانون بھی ہندوستان کے تمام باشندگان کے لیے نافذ کیا گیا تھا اور اس کا بنیادی مقصد کم سنی میں شادی کے رجحان کو روکنا تھا۔

معاشرت اور معیشت کے حوالے سے بدلتے ہوئے طرزِ حیات میں یہ مناسب تصور کیا گیا کہ لڑکا اور لڑکی دونوں کے لیے شادی کی صورت میں عمر کی ایک ایسی حد کا تعین کر دیا جائے جس کے بعد وہ خانگی زندگی کی ذمہ داریوں بہ شمول پیدائش اور پرورشِ اولاد کو احسن طور پر نبھا سکیں۔

علما نے اس قانون سازی پر احتجاج کیا تھا، کیوں کہ اسلام میں صغر سنی میں نکاح پر پابندی نہیں ہے۔ بالغ ہونے کے بعد لڑکے اور لڑکی کو خیارِ بلوغ کے ذریعے ایسے نکاح کو فسخ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ خیارِ بلوغ کے معاملات کو مسلم تنسیخِ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء کے تحت قانونی شکل دے دی گئی جیسا کہ پہلے تفصیلاً ذکر کیا جا چکا ہے۔

۳۶- ذوالفقار احمد، **عائلی عدالتوں کا قانون (فیملی کورٹس ایکٹ ۱۹۶۴ء)** دفعہ ۲۵، لاہور، نیشنل لا بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص ۶۴

۳۷- مسلم عائلی قوانین مع شرح و کیس لا، ترجمہ: چودھری ذوالفقار احمد ایڈوکیٹ، ضیاء الاسلام جنجوعہ ایڈوکیٹ، لاہور، ندیم لا بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۳

۳۸- ایم محمود، مرجع سابق، بہ حوالہ (PLD. 1962. 442)

۳۹- نفس مرجع، دفعہ (۲) بندش بچگانہ شادی ایکٹ، ص ۴۴۳، ۴۴۴

علما کی راے تقسیمِ ہند و پاکستان کے بعد بھی اس حوالے سے مخالفانہ رہی۔ حالاں کہ عصر حاضر میں بھی قبائلی معاشروں کی روایات اور اسلامی تعلیمات سے عدم آگاہی کی بنا پر کم عمری میں بچیوں کی بے جوڑ شادیاں کی جاتی رہی ہیں حتیٰ کہ بسا اوقات نوزائیدہ بچی کو بھی کسی کے نکاح میں دے دیا جاتا ہے۔ عموماً ایسی شادیاں غیر کفو سے ہوتی ہیں اور اسلام کے دیے گئے حق خیارِ بلوغ سے لاعلمی کی وجہ سے نہ صرف بچیوں پر ظلم کی وجہ بنتی ہیں، بلکہ اسلامی معاشروں کی بھی منفی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ خواتین کے حقوق کے نام پر مغربی مفاد کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں تو ایسی شادیوں کے خلاف آواز اٹھا رہی ہیں اور دینی حلقے انہیں حضرت عائشہؓ کی کم سنی میں منعقد نکاح کو دلیل بنا کر بلاوجہ اس کی حمایت کرتے ہوئے اس کے لیے جواز فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔

حق خیارِ بلوغ سے عدم آگاہی، اہل خانہ کے عدم تعاون اور قانونی نظام تک عدم رسائی کی بدولت بچپن کی شادیوں میں خیارِ بلوغ کا حق استعمال کرنا ہمارے معاشرے میں مروّج نہیں ہے۔

نابالغان کی شادی کے علاوہ معاملہ بلوغت کے باوجود کم عمری میں شادی کا بھی ہے۔ درحقیقت اسلام کی تعلیمات پر غور کیا جائے تو نکاح کی تمام تفاصیل میں لڑکے اور لڑکی کی بلوغت اور دونوں کی رضامندی ایک بنیادی امر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ قرآن پاک اور احادیثِ مبارکہ میں نکاح کے لیے بلوغت کو معیار بنایا گیا ہے، پھر عمومی طور پر دورِ رسالت میں اسی قاعدے پر عمل کیا گیا۔ جو لوگ معاشی طور پر نکاح کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے یعنی حق مہر کی ادائگی اور عورت کے نان نفقے کی ذمہ داری اٹھانے کی، انہیں اس وقت تک اپنی خواہش کو ضبط کرنے کے لیے روزے رکھنے کی ترغیب دی گئی۔ اس وقت آزاد محصنات خواتین کی جگہ اپنی لونڈی سے ازدواجی تعلق قائم کرنے کی بھی ترغیب دی گئی جس میں ذمہ داریاں نسبتاً کم تھیں۔ فقہانے تو ایسی صورتوں میں جب کوئی مرد، خانگی ذمے داریوں کو اٹھانے کے قابل نہ ہو تو نکاح کو ناپسندیدہ بھی قرار دیا ہے۔ بچیوں کے حوالے سے بھی بلوغت کے ابتدائی آثار کے بعد وہ فوراً ازدواجی زندگی اور بچوں کی پیدائش کے لیے جسمانی طور پر تیار نہیں ہوتیں، بلکہ اس سارے مرحلے میں کم از کم تین چار سال درکار ہوتے ہیں۔ بلوغت کے بعد یتیموں کا مال ان میں سمجھ بوجھ پیدا ہونے پر ان کے حوالے کرنے کا قرآنی حکم جسمانی بلوغت کے ساتھ ذہنی و نفسیاتی بلوغ کو بھی قابلِ توجہ گردانتا ہے۔

متعلقہ قانون دراصل مفادِ عامہ کے حوالے سے اصلاحِ احوال کی ایک کوشش تھی اور چونکہ اس میں کم عمری کی شادی پر سرپرستوں یا نابالغ سے شادی کرنے والے مرد پر معمولی سا جرمانہ یا سزا عائد کی گئی تھی اور خود ایسی شادی کی شرعی حیثیت متاثر نہیں ہوتی تھی، اس قانون کا مثبت نتیجہ یہ سامنے آیا کہ بعد ازاں مختلف معاملات میں مفادِ عامہ کے لیے اصلاحی اقدام کے طور پر قانون سازی ہوئی تو فقہا اور عدالتوں نے ان اصلاحی اقدامات کو تحفظ

فراہم کیا۔ مثلاً مسلم فیملی لا آرڈیننس ۱۹۶۱ء کے تحت نکاح کی رجسٹریشن، دوسری شادی کی صورت میں ثالثی کونسل کی اجازت، طلاق کی رجسٹریشن وغیرہ کو قانونی ضرورت قرار دیتے ہوئے مذکورہ بالا پر عمل کے باوجود نکاح اور طلاق کے انعقاد کو درست قرار دیا گیا۔[۴۰]

تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں مسلم فیملی لاز آرڈیننس ۱۹۶۱ء کے تحت اس قانون میں ترمیم کرتے ہوئے لڑکی کی شادی کی کم از کم عمر کو ۱۴ سال سے بڑھا کر ۱۶ سال کر دیا گیا اور اس سے کم عمر لڑکی سے شادی کو مستوجبِ سزا قرار دیا گیا۔ نیز سابقہ قانون میں ۲۱ سال سے زائد عمر کے مرد کا نابالغ لڑکی سے شادی کرنا مستوجبِ سزا تھا۔ جسے کم کر کے ۱۸ سال کر دیا گیا۔[۴۱]

اسلامی نظریاتی کونسل نے مسلم عائلی قوانین پر تفصیلی جائزہ رپورٹ میں یہ سفارش دی تھی کہ لڑکا اور لڑکی شرعاً بالغ ہوں تو قانون کے تحت مقرر کردہ عمر کو پہنچنے سے پہلے ان کو بلدیاتی کونسل کے چیئرمین سے اجازت حاصل کر کے نکاح کی اجازت ہونی چاہیے"۔[۴۲]

آزادیِ ہند کے بعد بھارت میں عائلی قوانین کے متعلق رجحانات

ہندوستان ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانوی حکومت سے طویل کشمکش کے بعد آزادی کی نوید لایا۔ مسلمانوں کے سامنے آزادیِ ہند کا سب سے بڑا مفاد یہ خیال تھا کہ اسلامی قانون، جسے انگریز نے اپنے جبر و استبداد سے منسوخ کر دیا تھا، بحال ہو گا اور پرسنل لا سے متعلق امور کے علاوہ دوسرے امور میں بھی اسلام پر چلنے کی آزادی ہو گی۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو دستور کے نفاذ کے بعد اندازہ ہوا کہ انگریز کی محکومی کے دور میں زندگی کے کچھ شعبوں میں اسلام پر چلنے کے جو مواقع مسلم پرسنل لا کے تحت حاصل تھے، وہ بھی ہندوستانی باشندوں کے لیے یک ساں سول کوڈ بننے کے بعد چھن جائیں گے۔ نئے دستورِ ہند میں حکومت کے لیے یک ساں سول کوڈ بنانے کے لیے راہ نمائی موجود تھی۔ دستورِ ہند کے چوتھے حصّے "ریاست کی پالیسی کے رہنما اصول" کے زیر عنوان دفعہ ۴۴

۴۰- اللہ رکھا بنام وفاقِ پاکستان، PLD 2000, FSC-1

۴۱- ایم محمود، مرجع سابق، ص ۴۴۲، بہ حوالہ (PLD, 1962, 442) ، بشیر حسین، **مسلم عائلی قوانین**، عرفان لا بک ہاؤس، ص ۴۲

۴۲- اسلامی نظریاتی کونسل، **رپورٹ مسلم عائلی قوانین ۱۹۸۳ء**، ۱۹۹۳ء، ط ۳، ص ۷۱

میں درج ہے کہ ریاست ہندوستان کے پورے علاقے کے شہریوں کے لیے یک ساں سول کوڈ بنانے کی کوشش کرے گی۔[۴۳]

دستور کے نفاذ کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ، جس کا اثر ہندو اور مسلم دونوں پر اور ہندو میرج ایکٹ جس کا اثر ہندو پرسنل لا پر پڑتا تھا، پاس ہوئے۔ پھر ہندو پرسنل لا کو منسوخ کر کے ہندو کوڈ بل پاس کر دیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں جب ہندو پرسنل لا میں ترمیم کی جارہی تھی تو مرکزی وزیر قانون نے ایک پریس کانفرنس میں کہا:

ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جارہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی۔ اگر ہم ایسا قانون بنانے میں کامیاب ہوگئے جو ہماری پچاسی فیصد آبادی کے لیے ہو تو اس کا نفاذ باقی آبادی پر مشکل نہ ہوگا۔ اس قانون سے پورے ملک میں یکسانیت پیدا ہوگی۔[۴۴]

مارچ ۱۹۷۳ء میں بنگلور میں یک ساں سول کوڈ کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے لا کمیشن کے چیئرمین مسٹر گجندر رگڈکر نے کہا:

مسلمانوں کو یک ساں سول کوڈ کو قبول کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لینا چاہیے۔ اگر انہوں نے خوش دلی کے ساتھ اسے قبول نہیں کیا تو قوت کے ذریعے یہ قانون نافذ کیا جائے گا۔[۴۵]

یک ساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششوں کی وجہ سے مسلمانوں کو شریعت ایکٹ یا آئین میں فراہم کیے گئے، مذہبی حقوق کا تحفظ مشتبہ نظر آنے لگا اور مسلمانوں کو حکومت سے شکایات پیدا ہونی شروع ہوئیں۔ دوسری طرف عدالتوں نے کھل کر اپنے فیصلوں میں مسلم پرسنل لا کی مخالفت شروع کر دی۔ مذہبی معاملات میں اس کھلی مداخلت پر مسلمانوں میں بے حد تشویش پیدا ہوئی۔ اس ضمن میں ایک اہم عدالتی فیصلہ شاہ بانو کیس کی شکل میں سامنے آیا۔[۴۶]

۴۳- عمر حیات خان غوری، **مسلم پرسنل لا پر اعتراضات کی حقیقت**، ص ۸۳۔ بہ حوالہ **بھارت کا آئین**، ترقی اُردو بورڈ، ص ۵۸

۴۴- سیّد حامد علی، **محمڈن لا اور اس میں تبدیلی**، دہلی، مکتبہ اسلامی، ط ۳، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹-۲۰

۴۵- اسیر ادروی، "مسلم پرسنل لا کیا ہے"، خصوصی اشاعت، **دارالعلوم نمبر**، ص ۴۳-۴۴

46 - B.R. Agarwala, *Plight of a Muslim Woman : the Shah Bano Case*, (New Delhi: Arnold-Heinemann, 1986), 14, 15

(شاہ بانو کیس ۱۹۷۸ء میں اپنے شوہر سے نان و نفقہ کے حصول کی ایک پٹیشن پر شروع ہو کر ۱۹۸۵ء میں مقدمے کی سماعت کے دوران طلاق دینے کے بعد اس کے سابق شوہر محمد احمد خان کی طرف سے ہائی کورٹ کے فیصلے (متعین نان نفقہ) پر اپیل کے بعد سپریم کورٹ کے فیصلے پر منتج ہوا۔)

۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ آف انڈیا نے تاریخ ساز شاہ بانو کیس میں مطلقہ کے نان نفقے اور طلاق سے متعلق ضابطہ ء فوج داری کے سیکشن ۱۲۵(A) کے تحت فیصلہ دیا جس میں مطلقہ کو نکاح ثانی یا انتقال تک نان نفقے کا حق دار ٹھہرایا گیا جب کہ مسلمانان ہند پہلے ہی سے دفعہ ۱۲۷ (۳) (b) کے تحت قانونِ ہند کی دفعہ ۱۲۵ (A) سے مستثنیٰ تھے۔ مزید برآں سپریم کورٹ نے اپنے اس فیصلے میں عورتوں کے بارے میں اسلامی احکام کو ظالمانہ قرار دیا اور نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث پر تبصرے میں تمسخرانہ انداز اختیار کیا۔ سپریم کورٹ نے اس معاملے میں نہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے تحت ایسے مقدمات کے گزشتہ نظائر کو اپنایا اور نہ پریوی کونسل کی ہدایت کا لحاظ رکھا کہ مذہبی احکام کی تشریح کا کام وہ ہرگز اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔[۴۷]

شاہ بانو کیس کے حتمی فیصلے نے ملک کے طول و عرض میں مسلم کمیونٹی میں ایک اضطراب پیدا کر دیا۔ علما اور دیگر مسلم اگر اس فیصلے کے مخالف تھے تو غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ کچھ روشن خیال مسلم بھی اس فیصلے کے حق میں رائے دے رہے تھے۔ مسلمانوں کے شدید احتجاج کے نتیجے میں حکومت نے "تحفظِ شریعت بل" کے نام سے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا۔ جس کا مقصد ایسی مسلمان عورتوں کے حقوق کا تحفظ تھا جنہیں ان کے شوہروں نے طلاق دے دی ہو یا جنہوں نے طلاق لی ہو۔

اس قانون کے ذریعے طلاق کی صورت میں عورت کے زمانۂ عدت کا تعین، دورانِ عدت میں عورت کا نان نفقہ، مہر کی ادائگی اور خاتون کی جائداد کی حوالگی سے متعلق ضابطہ بندی کی گئی۔ اس ایکٹ کے تحت مطلقہ عورت کے دوبارہ شادی نہ کرنے کی صورت میں اگر اس میں اپنا خرچہ چلانے کی سکت نہ ہو تو عدالت کے ذریعے مطلقہ عورت کے ان رشتہ داروں کے ذریعے جو اس کی وفات کے بعد اسلامی قانون کے مطابق اس کے ترکے میں حصہ دار ہوں، اس کے مناسب اور معقول نان و نفقہ کا بندوبست رکھا گیا ہے۔[۴۸]

یک ساں سول کوڈ کے قیام کی سمت پیش رفت، مذہبی معاملات میں عدالتوں کی مداخلت اور مغربی فکری یورش کے سبب ہندوستان میں خود مسلمانوں کے روشن خیال گروہ کی طرف سے مسلم پرسنل لا کو مبنی بر امتیازات قرار دیا گیا۔ اس صورتِ حال میں اپنے شخصی قوانین کو قائم رکھنا ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ہندوستان کی دینی قیادت نے مسلم عوام کی تائید سے، پسپائی سے بچتے ہوئے حتی الامکان اپنے

۴۷-مولانا شمس تبریز خان، "متاعِ طلاق اور نفقہ مطلقہ -ایک متفقہ مسئلہ"، خصوصی اشاعت، **دارالعلوم نمبر**، ص ۱۸۲،
Safia Iqbal, *Woman and Islamic Law* (Islamic Publications, 1987) ,218 - 219

۴۸- بی آر اگر والا، مرجع سابق، ص۱۴۹۔ ۱۵۲، بل کا متن، **دارالعلوم نمبر**، ص ۱۹۷-۲۰۰

پرسنل لا کو تحفظ فراہم کیا، نیز بدلتے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے تحقیق اور اجتہاد کا راستہ اپنایا اور متحدہ پلیٹ فارمز پر اپنی قوت کو مجتمع کیا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ، اسلامک فقہ اکیڈمی کا قیام اسی مقصد کے حصول کا نتیجہ اور ذریعہ بنے۔ البتہ خواتین کے ایک گروپ کا مسلم پرسنل لا بورڈ سے علاحدگی اختیار کرتے ہوئے اپنا علاحدہ آل انڈیا مسلم ویمن پرسنل لا بورڈ قائم کرنا لمحۂ فکریہ ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ دینی طبقات اور طبقۂ خواتین کے درمیان یہ بُعد کیوں پیدا ہوا؟ عصرِ حاضر میں خواتین کو درپیش مسائل کے حل کے لیے اپنی تاریخ کے گزشتہ ادوار کی طرح خود غالب دینی عنصر کیوں آگے بڑھ کر ان مسائل کے حل کے لیے کوشاں نہ ہو سکا جن کا سامنا خواتین کو ہے؟ کیا موجودہ صورت حال میں خواتین کے حقوق کے نام پر اسلامی قانون اور مسلم معاشروں کو شکست و ریخت کا نشانہ بنانے کی کوشش میں ہندوستان میں شخصی قوانین پر عمل درآمد کی محدود آزادی بھی چھیننے کی راہ ہموار نہیں ہوگی؟

آزادیِ ہند کے بعد پاکستان میں عائلی قوانین کے متعلق رجحانات

قیامِ پاکستان کے وقت آزادیِ ہند ایکٹ اور اس وقت جاری ہونے والے دیگر ایکٹس اور آرڈرز نے تمام موجود قوانین کے اجرا کو اس وقت تک کے لیے سندِ جواز عطا کی جب تک کہ ان میں کوئی ترمیم نہ کی جائے یا کالعدم قرار نہ دیے جائیں۔[۴۹] آزادیِ ہند ایکٹ کی دفعہ نمبر ۱۸ کی ذیلی دفعہ ۳ کے تحت ایک عبوری قدم کے طور پر **مجموعۂ تعزیرات ہند ۱۸۶۰ء** کو معمولی تبدیلیوں کے بعد **مجموعۂ تعزیرات پاکستان (Pakistan Penal Code)** کے نام سے اپنا لیا گیا۔ **مجموعۂ تعزیرات پاکستان** فوج داری اور دیوانی قوانین پر مشتمل تھا۔[۵۰]

مسلم پرسنل لا (شریعت) ایپلی کیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء کو مرحلہ وار تبدیلیوں کے ساتھ پاکستان میں نافذ کیا گیا جس کے تحت مسلمانوں کے باہمی معاملات میں مسلم پرسنل لا کا اطلاق ممکن بنایا گیا۔ مختلف صوبوں اور پھر ملکی سطح پر شریعت ایکٹ کے نفاذ کے لیے مرحلہ وار کئی ایکٹ نافذ ہوئے جن میں مغربی پنجاب مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۴۸ء، پنجاب مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق... ترمیمی ایکٹ ۱۹۵۱ء، مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء ترمیمی ایکٹ ۱۹۵۰ء برائے سندھ، مغربی پاکستان (پنجاب / سندھ / NWFP بلوچستان)،

---

49 - Hadayatullah, *Mulla's Muhammaden Law*, Revised edition. (Lahore: Mansoor Book House, 2003), 2

۵۰- **جرم زنا (نفاذ حدود) آرڈیننس ۱۹۷۹ء، ایک تجزیہ**، ویمن ایڈ ٹرسٹ ۲۰۰۶ء، ص ۱۵

مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۶۲ء، پنجاب مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق Removal of) (doubts آرڈیننس ۱۹۷۲ءاور ۱۹۷۵ء شامل ہیں۔[۵۱]

مزید بر آں Adaptation of Central Act and Ordinances Order, 1949 کے تحت پہلے سے نافذ العمل قوانین کو جزوی ترامیم کے ساتھ اختیار کیا گیا۔[۵۲] جن میں گارڈین اینڈ وارڈز (Guardian and Wards) ایکٹ ۱۸۹۰ء، بندش شادی بچگان ایکٹ ۱۹۲۹ء، مسلم تنسیخِ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء بہ شمول دیگر بہت سے قوانین شامل تھے۔

قیامِ پاکستان سے قبل مسلم پرسنل لا شریعت اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء میں رواجی قانون کی بناپر زرعی زمین اور وصیت کردہ جائداد کے معاملات کو اس قانون کے دائرہ کار سے باہر رکھا گیا تھا۔ پاکستان میں نافذ ہونے والے شریعت ایکٹ کے ذریعے اسلام کے شرعی قانون کے مطابق زرعی زمین کو بھی وراثت کے ضمن میں شامل کیا گیا۔ قانون پر عمل درآمد کے دوران جہاں مسائل یا رکاوٹیں محسوس ہوئیں وہاں ترمیمی قانون متعارف کروایا گیا۔ زرعی زمین کی وراثت کے معاملے میں شمولیت کا خواتین کے حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا، کیوں کہ ۱۹۳۷ء کے شریعت ایکٹ کی روشنی میں خواتین اپنی وراثت کے جائز حق سے محروم تھیں۔ اس ایکٹ کے ذریعے جائداد سے متعلق دیگر رواجی قوانین کا بھی خاتمہ ہوا اور عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ وہ اسلامی قوانین کی از سر نو تعبیر کر سکیں اور برطانوی دور میں عدالتوں کے سابقہ نظائر سے اختلاف کر سکیں۔

پاکستان میں عائلی قوانین کی اصلاحات کے لیے دو سطحوں پر جدوجہد شروع تھی، جس میں سے ایک کا عنوان عمومی طور پر پاکستان میں اسلامی قوانین کی تدوین اور نفاذ تھا اور دوسرا عنوان خواتین کے حقوق کا تحفظ تھا جس کے لیے سب سے سرگرم تنظیم آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن(APWA) تھی۔ جب کہ مجموعی طور پر اسلامی قوانین کے نفاذ کی کوششوں میں عوام کی خواہشات کے ساتھ علما اور دیگر راہنمایانِ ملت تھے اور یہ ایک دستوری اور آئینی سفر تھا۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد متفق علیہ قانونی اور دستوری دستاویز کے طور پر منظور کی، جس کی رو سے پاکستان پر اللہ کی حاکمیت کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمانوں کو

۵۱- ایم محمود، مرجع سابق، ص ۱۰-۹

52 - PLD. 1949, *Central Statulie*, 1

انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات اور ثقافتوں کے مطابق ڈھالنے میں مدد دینے کو ایک حکومتی ذمہ داری قرار دیا گیا۔[۵۳]

جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علما نے متفقہ طور پر ۲۲ آئینی نکات منظور کیے جو ایک متفقہ اسلامی دستور کی اساس بنے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا دستور نافذ ہوا جس میں پاکستان کو اسلامی جمہوریۂ پاکستان قرار دیا گیا۔ اس دستور میں یہ دفعہ شامل تھی کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو قرآن اور سنت کے منافی ہو، نیز موجودہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنائے جانے کا اعلان ہوا۔

مذکورہ بالا قرارداد معمولی تبدیلیوں کے ساتھ پہلے عبوری اور پھر ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین میں تمہیدی بیان کے طور پر موجود رہی۔ ۱۹۸۵ء میں آئین کی بحالی کے آرڈر کے ذریعے قرارداد مقاصد کو آرٹیکل A2 کے اضافے کے ساتھ آئین کا مستقل حصہ (Substantive Part) بنا دیا گیا۔ انہی دونوں دساتیر کی روشنی میں بعد ازاں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلامی نظریاتی کونسل اور فیڈرل شریعت کورٹ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا[۵۴]

ادارہ تحقیقات اسلامی اور اسلامی نظریاتی کونسل نے اسلامی قانون کی ضابطہ بندی میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ البتہ دستور کی رُو سے یہ ادارے محض قانون سازی کی سفارش کر سکتے تھے اور قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کی ذمہ داری قانون ساز ادارے کی تھی۔ عدلیہ کو کسی قانون کے اسلامی تعلیمات سے مطابقت یا عدمِ مطابقت کے جائزے اور متبادل فیصلے کے اختیار سے متعلق سپریم کورٹ میں شریعت اپیلٹ بنچ (سپریم کورٹ کے ۳ اور دو علما ججز پر مشتمل بنچ) قائم کیا گیا اور چاروں صوبوں کی ہائی کورٹس میں شریعت بنچ کے متبادل کے طور پر وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی جس کا مقصد ملک میں قوانین کی اسلامائزیشن کے عمل کو تیز کرنا تھا[۵۵] بعد ازاں وفاقی شریعت کورٹ کو کسی قانون کے خلافِ اسلام ہونے کے فیصلے کے حوالے سے ازخود عمل درآمد (suo motu)

۵۳- تنزیل الرحمن، **مجموعۂ قوانین اسلام**، ج۱، ص ۱۵

۵۴- تنزیل الرحمن، مرجع سابق، ج۱، ص ۱۸

Naseem Hasan Shah, *The Objective Resolution and its Impact on the Administration of Justice in Pakistan* (Islamabad: Shariah Academy, 1992), 2-4

55 - Naseem Hasan Shah, *Islamization of Law in Pakistan*, (Islamabad: Shariah Academy, 1992), 4-5

کا اختیار دیا گیا۔ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے اپیلٹ بنچ نے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے بہت سے عائلی معاملات میں ترامیم کیں اور متبادل قوانین پیش کیے۔[۵۶]

عائلی اصلاحات کے ضمن میں ملک کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کے نتیجے میں آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن کے تحت احتجاجی مہم کے مطالبے کے بعد ۱۹۵۵ء میں ازدواجی و عائلی کمیشن قائم کیا گیا۔ یہ کمیشن چوں کہ درحقیقت ایک خاص تناظر میں قائم ہوا تھا، لہٰذا اس مہم میں شامل زیادہ تر عام افراد وخواتین تھیں؛ البتہ اس میں شریعت کے حوالے سے ماہرانہ رائے دینے کے لیے ایک مذہبی اسکالر بھی شامل تھے۔ اس کمیشن نے چند محدود معاملات پر قانون سازی کی تجاویز دیں۔

کمیشن کی سفارشات کے متنازعہ ہونے اور اس پر ملک بھر میں علما کی سطح پر شدید ردعمل کے باوجود اسے مارشل لا دور میں ۱۹۶۱ء میں مسلم فیملی لاز آرڈیننس کے نام سے نافذ کیا گیا جسے بعد ازاں ہر دور میں دستوری تحفظ عطا ہوا۔

آرڈیننس کا مقصد طلاق کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور غیر ضروری تعددِ ازواج پر پابندی عائد کرنا تھا۔ اس قانون کے تحت یتیم پوتے کی وراثت، شادی کے اندراج، ایک سے زائد شادیوں اور ان کی اجازت، طلاق، طلاق کے علاوہ تنسیخِ نکاح، نان نفقہ اور مہر سے متعلق ضابطہ بندی کی گئی، نیز ثالثی کونسل کا ادارہ تشکیل دیا گیا۔ آرڈیننس کے نفاذ کو ممکن العمل بنانے کے لیے مغربی پاکستان مسلم فیملی لا قواعد ۱۹۶۱ء اور عائلی عدالتوں کے قواعد ۱۹۶۴ء وضع کیے گئے جن میں ۲۰۰۵ء میں مفید ترامیم لائی گئیں جو خواتین کو سہولت فراہم کرنے سے متعلق تھیں۔

متعلقہ قوانین کے لیے وزارتِ مذہبی امور، وزارتِ قانون اور اسلامی نظریاتی کونسل نے تفصیلی جائزوں میں اسلام سے متصادم کئی احکامات کی بنیاد پر منسوخی یا مناسب ترمیمات کی سفارشات پیش کیں۔ وفاقی شرعی عدالت نے ۲۰۰۰ء میں اس کی چند اسلامی دفعات سے متصادم دفعات یا ذیلی دفعات کو کالعدم قرار دینے کا فیصلہ دیا جسے حکومت نے سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ میں چیلنج کر دیا اور یہ معاملہ ہنوز زیر التوا ہے۔[۵۷]

۵۶- نفس مصدر، ص۵،۶

۵۷- اللہ رکھا بنام وفاقِ پاکستان PLD 2000. FSC.1

بعد ازاں اس معاملے کی تمام تفصیلات *The All Pakistan Legal Decisions, Federal Shariat Court, Vol*. 11, 2000. سے لی گئی ہیں۔

جیسا کہ پاکستان میں عائلی قوانین کی صورتِ حال کو زیرِ بحث لاتے ہوئے آغاز ہی میں یہ بات رکھی گئی تھی کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد پاکستان میں عائلی قوانین کے نفاذ اور اصلاحات کا عمل دو سطحوں پر شروع ہوا جن میں ایک کا عنوان اسلامی قوانین کا نفاذ اور دوسرا خواتین کے حقوق کا تحفظ تھا۔ نفاذِ شریعت ایکٹ کے نفاذ کے ساتھ ساتھ خواتین کو تعددِ ازواج کے حوالے سے درپیش تحفظات کی بنیاد پر خاندانی اور ازدواجی معاملات سے متعلق کمیشن قائم کیا گیا۔ معاشرتی بنیادوں کے ان اہم امور کے بارے میں اجتماعی نقطۂ نظر سے غور وخوض کے بعد قانون سازی کے بجائے محض خواتین کے حقوق کے نام پر یہ کام شروع کیا گیا۔ ملک میں موثر دینی طبقات کی موجودگی اور آئین میں متعلقہ دفعات کے باوجود پہلی اہم قانون سازی میں دین کی تعلیمات سے تصادم کی کوشش سامنے آئی۔ کمیشن میں علما کے نمائندے کی حیثیت سے محض ظاہری اور رسمی نمائندگی کی بنا پر آغاز ہی سے دینی طبقے اور حقوقِ نسواں کے لیے جدوجہد کرنے والی خواتین کے درمیان ایک معرکہ آرائی کی کیفیت سامنے آئی جو ملک میں ۱۹۷۹ء میں حدود قوانین کے نفاذ کے بعد سے بڑھتے بڑھتے ایک بہت بڑی خلیج کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ جس وقت تصادم کا یہ پہلا واقعہ رونما ہوا تو اس وقت ہی نیک نیتی سے صورتِ حال کا جائزہ لے کر چند قابل اعتراض شقوں، مثلاً طلاق کا طریقۂ کار اور یتیم پوتے کی وراثت، کو درست کیا جاسکتا تھا۔ قانون کے نفاذ کے بعد ارتقائی عمل سے گزرتے ہوئے دیگر بہت سے انتظامی معاملات میں ماہرینِ فقہ اور عدالتی فیصلوں کے ذریعے قانون سازی کے عمل کی تائید سامنے آگئی، مثلاً نکاح نامے میں کوائف کا اندراج اور نکاح کی رجسٹریشن، طلاق کی رجسٹریشن، دوسری شادی کے لیے اجازت وغیرہ۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ پہلے ملک کے مقتدر اداروں اور وزارتوں کی جانب سے ان قوانین کی منسوخی اور بعد ازاں خلافِ اسلام دفعات / ذیلی دفعات کی ترمیم کے فیصلوں کے باوجود حکومت نے ان فیصلوں کو التوا میں رکھا؛ جب کہ ۱۹۷۹ء میں ملک میں نافذ ہونے والے حدود قوانین کے خلاف خواتین کے حقوق کے نام پر چلائے جانے والی تحریک پر حدود قوانین میں ترامیم بذریعہ تحفظ حقوقِ نسواں ایکٹ ۲۰۰۶ء روبہ عمل لائی جاچکی ہیں۔ ان اقدامات کے باعث دینی طبقات تحفظات کا شکار ہوئے اور ان کا ردعمل سامنے آیا۔

ملکِ عزیز میں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ عائلی معاملات میں قانون سازی کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے ناگزیر ہے کہ اسلامی قانون کے حوالے سے مغرب کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ خاندان اور خصوصاً عورت کے کردار کے حوالے سے منفی اور غیر اسلامی رویوں اور رجحانات کی حوصلہ شکنی کی جائے اور ہر دو طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے مشترکہ متفقہ لائحہ عمل کے ساتھ قدم بڑھایا جائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عائلی معاملات سے متعلق حقیقی مسائل کو سامنے لا کر ان پر کھلے دل سے بحث و تمحیص کی جائے جو محض میڈیا ٹرائل اور رسمی و نمائشی نہ ہو، بلکہ اس کی حقیقی روح اور ان معاملات کے تمام متعلقہ افراد کو شامل رکھتے ہوئے ایک متفقہ لائحہ عمل کے ساتھ حل کی طرف قدم بڑھانا ہو گا۔ اگر ہمارے ملک کی تمام مخالف و متحارب سیاسی جماعتیں ۱۹۷۳ء کے آئین کے سلسلے میں متفقہ موقف لانے میں کامیاب ہو سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان معاملات پر متفقہ قانون سازی کے عمل کو آگے نہ بڑھا سکیں۔

جن عنوانات پر قانون سازی کی ضرورت ہے وہ بھی محض اقدامی اور دفاعی ایجنڈا نہ ہو، بلکہ پاکستانی معاشرے کو درپیش حقیقی مسائل کی نشان دہی بھی دونوں طبقات، یعنی خواتین اور دینی طبقات کے نمائندوں، کی طرف سے متفقہ ہو۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم فیملی لا آرڈیننس پر تمام تحفظات کے باوجود اس قانون نے خواتین کے حقوق، خصوصاً نان نفقہ، بچوں کی حوالگی، خلع اور دیگر معاملات کے حوالے سے اہم مثبت کردار ادا کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب اس کی منسوخی کے مطالبے سے دستبردار ہوتے ہوئے اس عمل کو آگے بڑھایا جائے۔ فیڈرل شریعت کورٹ کے جو ترمیمی فیصلے سپریم کورٹ اپیلٹ بنچ میں زیر التوا ہیں، اُن پر قانونی کارروائی مکمل کی جائے۔ طلاقِ ثلاثہ، کاروکاری، وَنّی، سوارہ[۵۸] پر قانون سازی کے عمل کو آگے بڑھایا جائے۔ خواتین کے حقِ وراثت، خصوصاً زرعی زمینوں کے حوالے سے عملی نفاذ کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ معاشرے میں خواتین پر ہونے والے تشدد کی مختلف صورتوں کا نوٹس لیتے ہوئے خواتین کے تحفظ کو گھروں، راستوں اور جائے ملازمت پر ممکن بنایا جائے اور تمام تر قوانین سازی کے بعد ہر سطح پر ان کا نفاذ ممکن اور سہل بنایا جائے۔

۵۸- کاروکاری، وَنّی اور سوارہ ظالمانہ اور قبیح رسموں کے نام ہیں۔ کاروکاری کی حقیقت یہ ہے کہ دو مرد اور عورت کو کسی شبہے کی بنیاد پر (یا اکثر کسی دشمنی کی بنا پر) غلط تعلقات میں ملوث ہونے کا الزام دیا جاتا ہے، ایسے مرد کو 'کار' اور عورت کو 'کاری' کہتے ہیں۔ پنچایت بیٹھ کر ان کے قتل کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ وَنّی یا سوارہ ایک رسم کے دو نام ہیں، پنجاب میں اسے وَنّی جب کہ خیبر پختون خواہ میں سوارہ کہا جاتا ہے۔ اس رسم میں دو خاندانوں میں صلح کی خاطر جرگے یا پنچایت کے ذریعے بہ طور ہرجانہ لڑکیاں حوالے کر دی جاتی ہیں اور اکثر اوقات انہیں بڑی عمر کے لوگوں کو دے دیا جاتا ہے۔ (مدیر)

شادی بیاہ سے متعلق چند سماجی مسائل کے حوالے سے جو قوانین پاکستان میں متعارف کروائے گئے،(۵۹) ان کا غیر موئثر ثابت ہونا جہاں ہمارے نفاذِ قانون کے نظام کی ناکامی کو ظاہر کرتا ہے، وہیں یہ بھی واضح کرتا ہے کہ سماجی اور معاشرتی مسائل کو قانون کے ذریعے ایک حد تک نمایاں تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی اصل اصلاح، آگہی اور تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ قرآن و سنت میں تمام سماجی و معاشرتی معاملات کو سدھارنے کے لیے احتیاطی اور اصلاحی تدابیر موجود ہیں جنہیں بنیاد بناتے ہوئے ہی معاشرے میں امن و سکون قائم کرنے کی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے ملک گیر سطح پر ایک ترغیباتی مہم کی ضرورت ہے۔ جس میں عوامی نمائندے، سیاسی قائدین، علمائے کرام، غیر سرکاری تنظیمیں اور خود عوام الناس شامل ہوں۔ معاشرتی مفاسد کے خلاف اجتماعی جہاد عصرِ حاضر کی عین ضرورت ہے۔

بہتری کے لیے تجاویز

۱. عائلی معاملات پر قانون سازی کے عمل میں معاونت کے لیے مختلف اسلامی ممالک میں رائج الوقت قوانین کا شرعی اعتبار سے جائزہ لیا جانا چاہیے اور ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل کی کوشش کی جانی چاہیے۔

۲. اجتہاد کے ذریعے جدید مسائل کے حل کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ممتاز فقہائے اسلام کی مجلس قائم کی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں OIC اور رابطہ عالم اسلامی میں قائم شدہ ایسی مجالس کو فعال اور موئثر بنانے کی ضرورت ہے تاکہ مقامی مجالسِ فقہا اہم متنازعہ مسائل کے حل کے لیے ان سے رجوع کر سکیں۔

۳. وکلا، ججز، قانون ساز اداروں اور وزارتوں کے افراد (ممبران قومی اسمبلی و ممبران سینٹ) اور قانون پر عمل درآمد کرنے والے اداروں کے افراد کو ملکی قوانین کے ساتھ اسلامی تعلیمات سے آگاہی دی جانی چاہیے۔

۵۹- شادی بیاہ سے متعلق سماجی و معاشی مسائل، مثلاً جہیز کی نمائش، طلبِ جہیز، ناچاقی یا تفریق کی صورت میں دلہن کے لیے جہیز کی ملکیت کا ثابت نہ ہونا، نیز شادی کی تقاریب پر بے جا نمود و نمائش اور فضول اخراجات کی اصلاح کے لیے مختلف قوانین وضع کیے گئے جن میں مغربی پاکستان جہیز (ممانعت نمائش) ایکٹ ۱۹۶۷ء، جہیز و تحائف دلہن (پابندی) ایکٹ ۱۹۷۶ء، شادی بیاہ کی تقریبات (فضول اخراجات اور بے جا نمود و نمائش پر ممانعت) آرڈیننس ۱۱، ۲۰۰۰ء اور پنجاب میں شادی کی تقاریب پر فضول اخراجات اور نمود و نمائش پر ممانعت کا ایکٹ ۲۰۰۳ء، و دیگر شامل ہیں۔ بہ حوالہ ایم محمود، مرجع سابق

۴. عائلی معاملات کے حوالے سے قائم کردہ خصوصی کمیشن ر کمیٹی کے ذمہ داران کے تعین میں قانونی اور شرعی سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد کے مابین توازن ہونا چاہیے۔

۵. علما اور مذہبی سکالرز کو عائلی معاملات کے حوالے سے ملکی قوانین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنا چاہیے، نیز مسلسل اجتماعی غور و فکر کے ساتھ ان دونوں میں مطابقت اور نئے پیش آمدہ حالات کے لیے قانون سازی میں مقننہ کی مدد کرنی چاہیے۔

۶. عائلی مسائل میں جس پہلو سے حکومتی مداخلت ضروری ہو وہاں اسلامی تعلیمات سے مطابقت رکھتے ہوئے اسے ممکن بنایا جانا چاہیے، تاہم خاندانی امور میں حکومت کی بے جا مداخلت کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔

۷. مساجد، مدارس اور تعلیمی اداروں کو معاشرتی اور سماجی راہ نمائی کے مراکز کا کردار ادا کرتے ہوئے عوام الناس کے لیے عائلی معاملات میں مسلسل راہ نمائی کا انتظام کرنا چاہیے۔

۸. عائلی معاملات میں شرعی اور ملکی قوانین کے حوالے سے زوجین کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس کے لیے والدین کو بچوں کی عمر کی مناسبت سے مناسب راہ نمائی فراہم کرنی چاہیے۔ نصاب میں مناسب قانونی اور اخلاقی راہ نمائی شامل ہونی چاہیے۔ نیز ایسے ادارے تشکیل دیے جانے چاہییں جو زوجین کو شادی سے قبل خاندان کے استحکام کے لوازم، باہم حقوق و فرائض اور ازدواجی زندگی کے حوالے سے مختلف اہم پہلوؤں پر تعلیم و تربیت اور مشاورت مہیا کریں۔ یہ ادارے محلوں کی سطح پر بھی قائم کیے جاسکتے ہیں اور سنجیدہ و فہمیدہ لوگوں کو اس میں شرکت پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔

۹. طلاق اور دیگر عائلی معاملات کے بارے میں شرعی اور قانونی معلومات سادہ اور آسان انداز میں میڈیا مہم کے ذریعے عوام کو دی جانی چاہییں، نیز نکاح کے موقع کو زوجین اور خاندان کی عائلی قوانین سے آگاہی کا ذریعہ بنایا جانا چاہیے۔

۱۰. پاکستان کے تناظر میں مسلم فیملی لا آرڈیننس ۱۹۶۱ء میں طلاق اور وراثت سے متعلق دفعات کی اسلامی قوانین سے عدمِ مطابقت کو ختم کیا جانا چاہیے، نیز اسلامی تعلیمات کی روشنی میں غور و خوض کے بعد طلاقِ بدعت پر تعزیری سزا، طلاق پر گواہوں کا تقرر، متاع طلاق اور طلاق و نکاح نامے میں مزید تفصیلات کی شمولیت پر اضافے کیے جاسکتے ہیں۔

۱۱. حصولِ وراثت کی عدالتی کارروائی کو عائلی عدالتوں کے دائرہ کار میں لایا جانا چاہیے تاکہ کورٹ فیس اور مقدمے کے تعین مدت کی بنا پر عمومی طور پر خصوصاً خواتین کے لیے حصولِ جائداد آسان ہو۔[۶۰] اور جس وقت تک جائداد ورثا کو منتقل نہ ہو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو عدالت کے ذریعے تمام ورثا میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

۶۰- عائلی عدالت میں ایک مقدمے کی فیس محض ۱۵ روپے ہے، جب کہ حصولِ وراثت کے لیے دیوانی عدالت میں ۱۵ ہزار روپے تک فیس ادا کی جاتی ہے، نیز عائلی عدالتیں اپنے مقدمات کا فیصلہ ۶ ماہ کی مدت میں کرنے کی پابند ہیں جب کہ دیوانی عدالتوں میں مقدمات سالہا سال چلتے رہتے ہیں۔